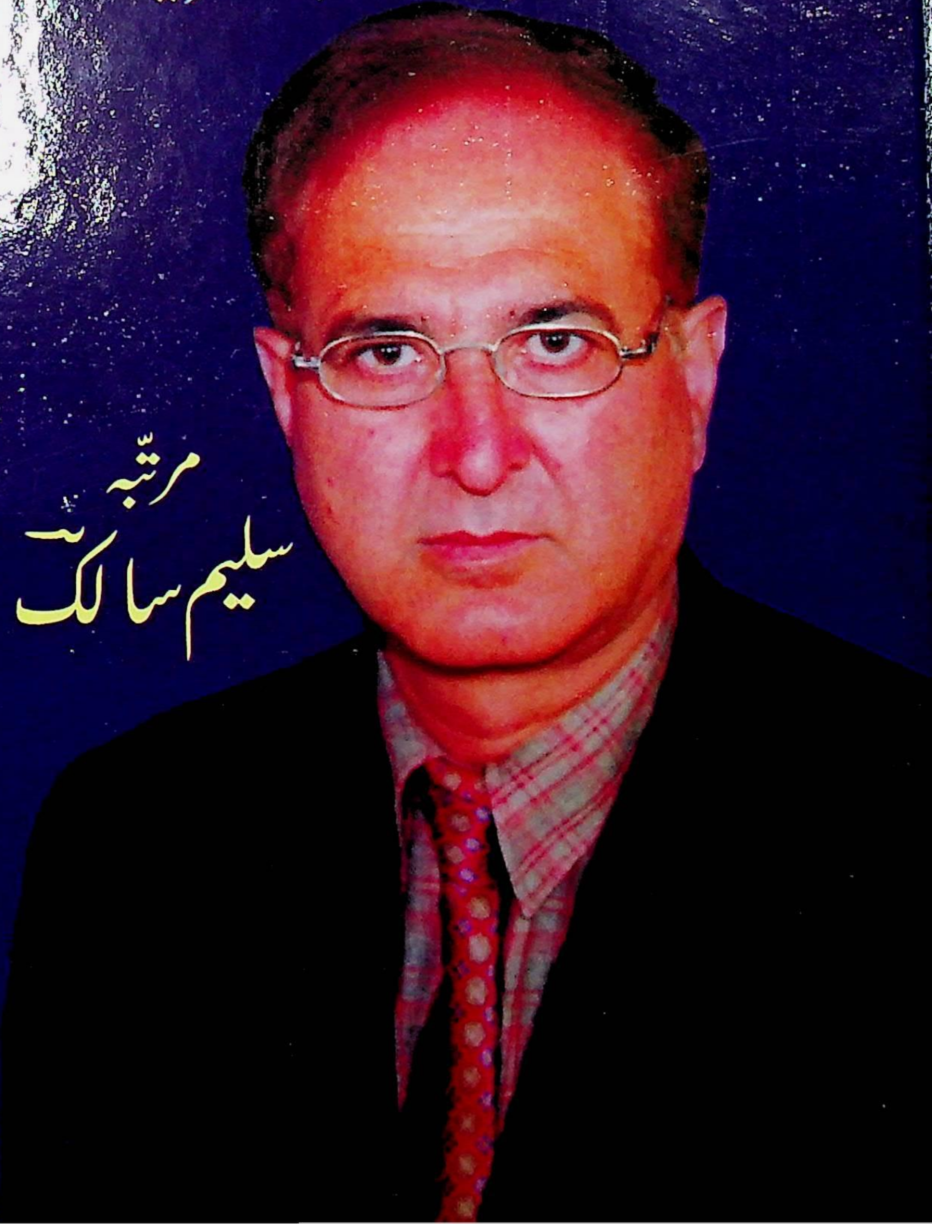
فرید پربتی

شعر، شعور اور شعریات



مرتّبہ

سلیم سالک

فرید پربتی

شعر، شعور اور شعریات

مرتّبہ

سلیم سالک

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

FARID PARBATI
Sher, Shaoor Aur Sheriyat
Edited by
Saleem Salik
Year of Edition 2006
ISBN 81-8223-198-1
Price Rs.250/-

نام کتاب	فریؔد پربتی — شعر، شعور اور شعریات
مرتّبہ	سلیم سالکؔ
سنِ اشاعت	۲۰۰۶ء
قیمت	۲۵۰ روپے
مطبع	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(India)
Ph·: 23216162, 23214465, Fax : 0091-011-23211540
E-mail: ephdelhi@yahoo.com

اِنتساب

اپنے والدین

اور بھائی جان

کے نام

جنہوں نے مجھے ہمیشہ

خوب سے خوب تر کی جستجو کی ترغیب دی ہے۔

ترتیب

مضامین

پیش گفتار

عصری ادبی منظرنامے پر جو روشن اور تابناک ستارے اپنی جگہ بنانے میں کامیاب وکامران ہوئے۔ ان میں فرید پربتی ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کی ہمہ جہت شخصیت کے پہلوؤں کا دائرہ کار علمی و عملی سطح پر وسیع معنوں میں پھیلا ہوا ہے۔ کبھی وہ شاعر بن کر ابھرتے ہیں تو کبھی محقق و نقاد کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ کبھی عروض و اصلاح کے شناور بن کر، تو کبھی خالص رباعی گو شاعر بن کر سامنے آتے ہیں غرض جس میدان میں بھی قدم رکھتے ہیں تو اس کو پامردی سے پامال کر کے دم لیتے ہیں۔

فرید پربتی کی شاعری میں قدیم و جدید کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔ جس سے وہ ایک منفرد لہجہ تراشنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ انہوں نے عمیق مطالعے اور گہرے مشاہدے سے ایک ایسی شعری دنیا تخلیق کی ہے جس کی معنیاتی اور جمالیاتی ترسیل عام قاری کیلئے بھی تسلی اور تشفی بخش ہے۔ فرید پربتی زبان و بیان پر قدرتِ رکھنے کے باوجود سہل اور آسان پیرائے میں اپنے داخلی و خارجی احساسات و تجربات کو شعری پیکر دینے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں یہی خاصیت فرید پربتی کو ان کے ہم عصر شعراء سے ممتاز و ممیّز کرتی ہیں۔

فرید پربتی نے روایتی اسلوب کو ایک نیا آہنگ و پیراہن بخش کر ایک نئی ڈگر قائم کرنے کی کوشش ہے۔ جو قابل تعریف ہی نہیں بلکہ قابلِ تقلید بھی ہے۔ انہوں نے ذہنی اختراع اور تخلیقی صلاحیت کو بروئے کار لا کر رباعی جیسی مشکل صنف

سخن کو منہ ہی نہیں لگایا بلکہ اس میں باقاعدہ مردِ میدان کی حیثیت اختیار کر کے رباعی کے نقاد کے طور پر بھی ایک شناخت بنالی ہے۔

فرید پربتی نے اپنے تخلیقی جوہر صرف شاعری تک ہی محدود نہیں رکھے بلکہ نثر میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ انہوں نے شاعری کی فنی باریکیوں کے علاوہ اصلاحِ سخن کی روایت پر خامہ فرسائی کر کے عمیق و دقیق مسائل کو نہایت آسان زبان میں سلجھایا ہے۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ جن موضوعات سے نئی نسل دور بھاگ رہی ہے فرید پربتی ان موضوعات کو بڑی سرخروئی سے گلے لگاتے ہیں۔

جہاں تک فرید پربتی کے تخلیقی سفر کا تعلق ہے انہوں نے پانچ شعری مجموعے اور دو نثری کتابیں لکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان کا ادب کے ساتھ سچا کمٹ منٹ ہے جو ان کو ہر وقت تخلیقی اور تالیفی کام میں مصروف رکھتا ہے اور خود وہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں لگے رہتے ہیں۔ ساتھ ہی تخلیق کی تیسری آنکھ کو بھی کھلا رکھتے ہیں تاکہ مطالعہ و مشاہدہ سے نئی نئی تخلیقات کو منصۂ شہود پر لا سکے۔

فرید پربتی کی تحریریں خواہ تحقیق ہو یا تنقید، ان کا ایک غیر جانبدارانہ نظریہ فن ہے۔ وہ مدلل و مفصل اپنے نقطۂ نظر کو معروضی طریقے سے پیش کرنے میں ماہر ہے۔ انہوں نے کلاسیکل شاعری سے پھوٹنے والے بیشتر سرچشموں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی ذہنی سطح کو بالیدگی اور وسعت نظری سے ہمکنار کیا ہے۔ غرض فرید پربتی کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا دائرہ کار اس قدر پھیلا ہوا ہے کہ اس چھوٹی سی کتاب میں اسے سمیٹنا آسان نہیں۔ تاہم میں نے نمائندہ پہلوؤں سے متعلق مضامین، تاثرات، تنقیدی آراء، معاصر ادبی رسالہ کا مکالمہ اور مشاہیر کے خطوط کا ایک اجمالی خاکہ مرتب کرنے کی کوشش ہے۔

میری یہ کاوش ادھوری رہتی اگر حامدی کاشمیری صاحب، پروفیسر عبدالحق صاحب، محمد یوسف ٹینگ صاحب، پروفیسر عبیدالرحمٰن ہاشمی صاحب، پروفیسر قدوس جاوید صاحب، پروفیسر اطہر سلیمان جاوید صاحب کے علاوہ دیگر مقتدر

اصحاب کے مضامین اور خطوط وقت پر نہیں ملتے۔ ان مضامین کو پڑھ کر فرید پربتی کے تئیں قدر کا مسئلہ خود بخود حل ہوتا ہے۔

اس کتاب کی تیاری کے سلسلے میں شروع سے آخر تک میرے رفیق دوست رؤف راحت کے مفید مشورے اور تعاون حاصل رہا۔ میں اس کیلئے ان کا خاص طور پر شکر گزار ہوں۔ ساتھ ہی غلام نبی سرشار صاحب کا ممنون ہوں انہوں نے ذریں مشوروں سے نوازا۔ اور وسیم احمد و نسیم اختر کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے مواد کی کمپوزنگ کرنے میں تندہی سے کام کر کے اس کو کتابی شکل دی۔

سلیم سالکؔ

فریدؔ پربتی......سانس لمحوں کے ماہ وسال

تزئین کار......افتخار امام صدیقی

رسال چہرہ ● آہو آنکھیں ● مکالمہ ہونٹ ● منتظر سماعتی گوش ● لباس میں سلیقگی ● اعتماد کے جوہر ● علم سمندر کے غواص ● استدلال واستدراک کے جویا ● جستجو طبیعت ● تلاش آشنا ● فقیری روح ● رباعی دیش کے مکھیا ● علم کے علمبردار ● سخن دریا ● عطر طینت ● مستقبل بیں ● سادہ لوح ● کشمیر رنگ خمیر ● معاون ودمساز ● مہمان نواز ● عاشق۔

یہ ہیں مستقبل کے امکان...... **فریدؔ پربتی**

فریدؔ پربتی......ماہ وسال کے نقوش

نام	●	غلام نبی بٹ
والدین	●	خواجہ حبیب اللہ۔ مصرہ خاتم
قلمی نام	●	فرید پربتی
سابقہ	●	ڈاکٹر (ادب)
پیدائش	●	۴؍اگست ۱۹۶۱ء سرینگر (کشمیر)

- تعلیمی قابلیت: ایم ۔کام۔ ایم۔ اے (اُردو)۔ ایم فل (اُردو۔۱۹۹۲ء) خلیل الرحمٰن اعظمی کی تنقید نگاری
- ڈاکٹریٹ: شاہ حاتم دہلوی۔ حیات وفن (۱۹۹۵ء)
- ملازمت: درس وتدریس شعبہ اُردو (کشمیر یونیورسٹی)
- ادبی ذوق وشوق: اُردو کلاسیکی ادب
- شعری مجموعے: ابرتر (۱۹۸۷ء)، آبِ نیساں (۱۹۹۲ء)، اثبات (۱۹۹۸ء) ،فرید نامہ (رباعیاں ۲۰۰۳ء)، گفتگو چاند سے (۲۰۰۵ء)، ہزار امکاں (۲۰۰۶ء)
- نئی کتابیں: شہ زور کاشمیری (حیات وفن۱۹۹۲ء) ۔ انتقاد واصلاح (۲۰۰۵ء)
- متوقع کتب: (۱) خلیل الرحمٰن کی تنقید نگاری (۲) حاتم شناسی (شاہ حاتم دہلوی۔ حیات و کارنامے) (۳) اُردو ادب میں اصلاح سخن کی روایت (۴) اُردو ادب میں تاریخ گوئی کی روایت (۵) تدوین۔ کلیات قلندر بخش جرأت (۶) داغ دہلوی کے کارناموں کی مکمل تدوین
- صحافتی شعور: ماہنامہ شہمیر (اردو) ۱۹۸۲ء تا ۱۹۸۴ء ، ماہنامہ آفاق (سرینگر) ۱۹۸۷ء تا حال، ماہنامہ پیامِ انقلاب (رکن ایڈیٹوریل بورڈ)
- گھر جنت: شمی (نصف بہتر)
- جائے مقام: Hill View Colony, Dana Bal Rawalpora, Srinagar 190005 (J&K) · Ph: 0194- 2300283, 2300239, Mobile : 09419402078 E-mail:ephdelhi@yahoo.com

نئ شعری فضا کا زائیدہ...... فرید

پروفیسر حامدی کشمیری

لگ بھگ ۱۹۶۰ء کے بعد اردو ادب میں ایک نئے تخلیقی دور کا آغاز ہوا تخلیق شعر کے ضمن میں خارجیت اور مقصدیت کے بجائے داخلیت اور جمالیاتی اثر آفرینی پر زور دیا جانے لگا، چنانچہ گزشتہ بیس پچیس برسوں میں شعری اور افسانوی ادب کے جو نمونے پیش کئے گئے اور پیش کئے جا رہے ہیں، وہ کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے ایک نئے تخلیقی دور کی نشاندہی کرتے ہیں۔ شعری رویے میں تبدیلی کا یہ عمل نہ صرف ملک کی مختلف زبانوں کے ادب میں نمایاں ہے بلکہ تقریباً ہر علاقے اور خطے کے ادیبوں اور شاعروں کے ذہن وفکر کا ایک لازمی حصہ بن چکا ہے کشمیر میں بھی نئ نسلوں کے شعور وفکر اور لسانی آگہی میں تبدیلی کا یہ عمل فروغ پا رہا ہے۔ یہ تبدیلی اتنی نمایاں ہے کہ ایک نئ حرارت بخش شعری فضا کا احساس ہوتا ہے اس فضا میں کئی نوجوان شعراء، اور افسانہ نگار (اُردو اور کشمیری) ملکی اور علاقائی زندگی کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے ساتھ ساتھ عالمی صورتحال کے حوالے سے شخصی کوائف و واردات کا ادراک کرنے کی سعی میں مصروف نظر آتے ہیں، فرید پربتی بھی جواں سال شاعر ہیں، وہ نہ صرف نئ شعری فضا کے زائیدہ ہیں بلکہ اپنے

اشعار کی رخشندگی سے اس فضا کی تابناکی میں اضافہ کرر ہے ہیں۔

فرید پربتی نئی غزل کے شاعر ہیں، نئی غزل موجودہ دور کے بحران کی تجسیم کاری کیلئے لفظ و پیکر کے علامتی امکانات کو حتی الامکان بروئے کار لاتی ہے، فرید پربتی نہ صرف موجودہ بحرانی صورتحال کا احساس رکھتے ہیں بلکہ وہ الفاظ کے ایمائی امکانات کی کھوج لگانے کی ضرورت کا بھی شعور رکھتے ہیں، یہ شعور و احساس اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب شاعر زندگی اور حقیقت کے بارے میں ایک انفرادی نقطۂ نظر قائم کرتا ہے، ظاہر ہے اسی صورت میں اس کے فکر و احساس کا انداز بدل جاتا ہے، یہ عمومیت کے بجائے اختصاصی ہونے پر اصرار کرتا ہے، نتیجے میں مروجہ اسالیب اظہار کی ایک نئی تشکیل کی ضرورت آن پڑتی ہے، فرید پربتی کی جو غزلیں میری نظر سے گزری، اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حقیقت کو اپنی نظر سے دیکھنا چاہتے ہیں اور پھر اپنے مشاہدات و احساسات کو اپنے اسلوب میں پیش کرنا چاہتے ہیں یہ دراصل اپنے وجود سے متعارف ہونے کا عمل ہے...... اپنے وجود کے اندر مخفی شعری ذخائر تک رسائی کا عمل، جو بہت کٹھن اور صبر آزما ہے، لیکن منزل یابی کیلئے ناگزیر ہے، فرید پربتی نے اسی دُشوار گزار راستے پر قدم رکھا ہے اُمید ہے کہ وہ اپنی لگن، ذوق اور آگہی کی مدد سے اپنی منزل کو پالیں گے۔

●□●

انتقاد و اصلاح......فرید پربتی

پروفیسر عبدالحق

ڈاکٹر فرید پربتی اُردو کے کئی بزرگ اساتذہ کی طرح تخلیقی جولاں گہی کو طے کرتے ہوئے تدریس کی طرف آئے ہیں۔ اُن کی اساسی شناخت سنجیدہ شعری اظہار اور باوقار فکری اسالیب کے حسن امتزاج پر قائم ہے۔ وہ غزلوں کے مختلف رنگ و آہنگ کا بھرپور شعور رکھتے ہیں۔ سینۂ سنگ کی خاراتراشی اور برف رتوں کی جاں گداز کیفیات سے سرشار شاعری سے لطف اندوز ہونے کیلئے ان کے فن میں بہت کچھ سامان موجود ہے۔ اس میں مقام و مظاہر کا غیر محسوس ذکر دامنِ احساس کو جنبش دیتا ہے۔ انہوں نے حال ہی میں رباعیوں کی طرف رجعت کی ہے۔ اس میں بھی فن کی نزاکتوں کے دوش بدوش تخلیق کے خوش آیند امکانات روشن کیا گیا ہے۔ درسی تقاضوں کے تحت ہر استاد کو تنقید و تشریح کے معاملات و مسائل سے ہمیشہ سروکار رہتا ہے۔ ڈاکٹر فرید پربتی نے چند مفید اور مطبوعہ مضامین کو مرتب کر کے اپنے انتقادی نظر سے ہمیں روشناس کیا ہے جس سے ان کی شخصیت کا تیسرا زاویہ تکمیل پاتا رہا ہے۔ تخلیق، تدریس اور تنقید کے درمیان وحدتِ فکر کی یہ تمثیل درِ دل کی کشادگی رکھتی ہے اور اصلاح و ایطا وغیرہ کی فنی وسعتوں کو آگہی بھی بخشتی ہے۔ ان مضامین میں تنوع بھی ہے اور تحقیق بھی۔ دو ایک موضوع تعارف و تبصرہ کی حیثیت رکھتے ہیں جیسے اسعد بدایونی مرحوم کی شاعری اور ڈاکٹر سلام سندیلوی

کی رباعی شناسی ہیں۔

ان مضامین میں بھی ایک تاثر ایک تہذیب شناسی کی نمایاں جھلک موجود ہے ڈاکٹر سلام سندیلوی مرحوم کی خدمات کا اعتراف ڈاکٹر فرید پربتی کے مخلصانہ اور علم دوستی سے لگاؤ کا اظہار ہے۔ مرحوم نے کئی نئے موضوعات پر قلم اٹھایا۔ نرگسیت، رباعی، منظر نگاری، تنقید اور شاعری کے مختلف موضوعات قلم بند کر کے وہ اپنی شناخت بنا چکے تھے۔ ان پر ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔ ڈاکٹر فرید کو رباعی سے خاص دلچسپی ہے شاید اسی لئے انہوں نے ڈاکٹر سلام سندیلوی کا انتخاب کیا ہے۔

اُنہوں نے ایک دوسرا اہم اور مفید مضمون دہلی کے شیخ ظہور الدین شاہ حاتم پر لکھا ہے۔ جس سے ان کی قدیم ادبیات سے دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔ راقم نے شاہ ظہور الدین حاتم کو شمالی ہند کا پہلا صاحب دیوان شاعر تسلیم کیا ہے اور پروفیسر محمد حسن کی رائے سے اختلاف بھی پیش کیا ہے۔ خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر فرید نے ناچیز کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے مزید دلیلوں سے اس بات کی توثیق کی ہے۔ بہر حال حاؔتم پر ان کا مضمون اپنی جامعیت اور معلومات کیلئے قابل قدر ہے۔ انہوں نے حاتم کے عہد پر بھی اظہار خیال کیا ہے اور ایک عبوری دور کی شعری روایات پر روشنی ڈالی ہے ساتھ ہی ایہام گوئی کے اسباب اور اس کے نشیب و فراز پر تنقید و تجزیہ سے کام لیا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ وہ شاہ حاؔتم کے سلسلہ شعری پر بھی نظر رکھے ہیں سودا، رنگیں سے بیسویں صدی تک ان کی نگاہ میں معنوی استفادے کا تسلسل ایک خیال افروز پہلو ہے۔ جس پر مزید گفتگو کی بڑی گنجائش ہے۔ اس شجرۂ شعری کی بازگشت اور ان کے اسالیب و اظہار پر سنجیدہ گفتگو کا آغاز کر کے ڈاکٹر فرید پربتی نے غور و فکر کو دعوتِ نظر دی ہے۔ امید کرتا ہوں کہ وہ اس عنوان کو مزید معلومات سے ہمکنار کریں گے۔ اور تخلیق کار کی نظر سے تنقیدی مباحث کا تجزیہ پیش کر کے دونوں کے باہمی اشتراک و امتزاج کی اساس فراہم کریں گے۔ میں انکی اس کوشش کو آفریں باد کہتا ہوں۔

●□●

نئی شعری روایت کا امین......فریدؔ پربتی

محمد یوسف ٹینگ

فریدؔ پربتی اُردو شعراء کی جدید ترنسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ چند ہی سال میں انہوں نے تیز تیز ڈگ بھرے ہیں۔ ان کی رباعیات، جو اس مجموعے میں شامل ہیں ایک حد تک مجھ جیسے قاری کیلئے خوشگوار اچنبھے کی چیز ہیں۔ اُردو میں رباعی استادی کی مہر تصدیق ہے لیکن نہ غالب اپنی رباعیوں کو اپنی غزل کی سطح پر لا سکے اور نہ اقبال کم از کم اُردو میں اپنے قطعات کو درجہ اول کا امتیاز عطا کر سکے۔ اس پس منظر میں ایک نوخیز اور نو آموز کشمیری الاصل شاعر کا اس صنف میں نوا سرا ہونا ایک جرأت مندانہ پہل ہی کہلائے گا۔ لیکن تخلیقی ادب کا یہ عجیب اسرار ہے کہ وہ اپنے اظہار کیلئے موزوں ادیب کا قلم ڈھونڈ نکالتی ہے۔ فریدؔ پربتی کا مزاج بھی رباعی کہنے کے فن سے کہیں متصل اور ملحق ہے۔ اس لئے اُن کی رباعیوں میں ایک برجستہ پن کا احساس ہوتا ہے۔ کشمیر کے کہنہ مشق سخنور میر غلام رسول نازکیؔ نے اس صدی کے پانچویں دہے میں اپنا اُردو مجموعہ ''دیدۂ تر'' کے نام سے شائع کیا تھا۔ جس میں اُن کی چند غزلوں کے علاوہ اُن کے قطعات بھی شامل تھے اور اُن کی افتادِ طبع کے غماز تھے۔ بعد میں اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن سامنے نہ آسکا۔ لیکن نازکی صاحب کی تخلیقی کاوشوں کا پیوند کشمیری زبان کو لگ گیا۔ چنانچہ اُن کی تخلیق کاری یہاں پر قطعات میں ہی سامنے آئی اور یہی اُن کی پہچان ہیں۔

فریدؔ پربتی کے اظہار میں ایک بے تکلفی کا جو احساس ملتا ہے اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رباعی اُن کے مزاج کو راس آئی ہے اور وہ اس سنگ صفت صنف کو پگھلانے اور اپنی پسند کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جس کی مثالیں اس مجموعے کے صفحات پر اِدھر اُدھر بکھری ہوئی ملیں گی۔ کہیں کہیں ان کے یہاں عصری اور تازہ حسیت کا عنصر نظر آتا ہے مگر کئی اور جگہ پر وہ پرانی آوازوں کی بازگشت کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں مثلاً اُن کی یہ رباعی ملاحظہ ہو۔

برباد ہوا صحنِ چمن رقص میں ہوں
ویرانہ بنا اپنا وطن رقص میں ہوں
باقی نہیں ارتباطِ روح و تن اب کے
رہبر ہے بہ شکلِ راہزن رقص میں ہوں

تیسرے مصرعے کے ڈھیلے ڈھالے پن کو نظر انداز بھی کریں پھر بھی مرزا غالبؔ کا یہ مصرع فریدؔ کی ذہنی کیفیت ہی نہیں بلکہ اُن کے اظہار پر چھایا نظر آتا ہے۔

بے ہودہ درمیانِ سموم و صبا بہ رقص

فرید پربتی نے رباعی کے سانچے کو تو قابو کر لیا ہے لیکن اس کے الفاظ و اظہار میں جو صلابت اور صیقل ہونی چاہیئے اس کیلیئے انہیں بہت محنت کرنا پڑے گی۔ رُباعی کے چوتھے مصرعے میں جو ڈنکے کی بڑی چوٹ ہوتی ہے اُس کی تلاش بھی ضروری ہے۔ زبان کے برتاؤ اور الفاظ کے چناؤ کیلیئے انہیں بقولِ شاعر بہ سینہ می سُپرم راہ، جیسی حزم و احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ یہ سخت کوشی اُن کے اپنے انتخابِ سخن میں مضمر ہے۔ آثار و قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس ہفت خواں کو طے کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگر وہ ایسا کر سکے تو وہ اپنے لئے، کشمیر کیلیئے اور اُردو کیلیئے ایک تخلیقی سنگ میل ثابت ہوں گے۔

طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

●□●

نئے رنگ و آہنگ کا احساس.....فرید

شمس الرحمٰن فاروقی

رباعی کے فن کے بارے میں یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ اچھی رباعی کہنا جتنا مشکل ہے اتنا ہی آسان خراب رباعی کہنا ہے۔ گذشتہ دنوں میں رباعی کا جو فیشن سا چل پڑا ہے اس کی بدولت مختلف پرچوں میں بھانت بھانت کی رباعیاں نظر آتی ہیں وہ طبیعت کو منغض کرتی ہیں، دوسری بات یہ کہ رباعی کے کئی اوزان ایسے ہیں جنہیں اکثر لوگ ہاتھ نہیں لگاتے ہیں لہٰذا زمانۂ حال کی رباعیوں میں یکسانی اور یک رنگی حاوی نظر آتی ہے۔ جو اوزان رباعی کیلئے جائز قرار دیئے گئے ہیں ان میں سے دو ہی تین کا استعمال رباعی کی صنف میں تنوع کے امکان کو ختم کر دیتا ہے۔

فرید پربتی نے ان دنوں کثرت سے رباعیاں کہی ہیں، میرا خیال ہے کہ وہ رباعی کے فن کی رعایتیں ملحوظ رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جو رباعیاں میں نے دیکھیں ان میں کہیں کہیں نئے رنگ اور نئے آہنگ اور نئے احساس کی چمک نظر آئی۔

رباعی کے بارے میں عام خیال ہے کہ اسے حکیمانہ مضامین کیلئے ہی استعمال کیا جائے تو بہتر ہے۔ بعد کے لوگوں نے اس کلیشے کو توڑنے کی کوشش کی لیکن ابھی مزید کوشش کی گنجائش ہے میں فرید پربتی کو ان کی مساعی کیلئے مبارکباد دیتا ہوں۔

فرید پربتی کا شعری ارتقاء

قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی

جس طرح سے ہر دور کا شعری و ادبی قافلہ اپنی شناخت کے لئے کچھ خاص طرح کے نشانِ امتیاز لے کر نمودار ہوتا ہے، چھٹی اور ساتویں دہائی کی شاعری بھی اپنی پہچان اپنے ساتھ لے کر ظاہر ہوئی۔ اِس عہد سے وابستہ بہت سی رطب و یابس اور جدیدیت کی پیدا کردہ بعض منفی خصوصیات کے ماسوا نئے دور میں شاعر اس بات کی کوشش میں مصروف نظر آتا ہے کہ وہ شاعری کی دائمی اور آفاقی اقدار و روایات یعنی اس کی جمالیاتی اور لسانیاتی بنیادوں پر مضبوطی کے ساتھ کھڑا ہو سکے۔ برصغیر میں جنم لینے والی اس نئی شعری روایت سے جو لوگ وابستہ ہوئے ان میں ایک نام فرید پربتی کا بھی ہے۔ فرید پربتی کے نام اور کلام سے ان کا عہد اور ماحول کچھ اس درجہ شدت کے ساتھ جڑا ہے کہ جہاں اِس ربط سے فرید پربتی کی پہچان قائم ہوتی ہے، وہاں ان کی شاعری کا دائرہ تھوڑا سمٹ بھی جاتا ہے۔ تاہم ان کی تازہ شعری تخلیقات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس حد میں رہتے ہوئے بھی اپنی راہ الگ نکالنے کی جستجو کرتے ہیں اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

فرید پربتی کی شعری جمالیات کا نکتۂ حوالہ اور محور بالعموم وادیٔ کشمیر کی زندگی ہے۔ اس کے دریا، چمن زار، سرسبز ماحول اور احساسی کیفیات کا حامل گردوپیش کا منظرنامہ ہے جو شاعر کے وجود کے رگ و ریشے میں گرم خون کی مانند

گردش کرتا ہے۔ یہاں معروف انداز کی منظرنگاری کی طرف میلان ہرگز نہیں ہے۔ البتہ صریح اشاروں اور بلیغ کنایوں کے ذریعہ شاعر کی نفسی اور تخیلی ترجیحات وترغیبات تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ یہاں موسموں کی تبدیلی سے رونما ہونے والے احساسات کی بھی گرم بازاری ہے اور اس جان لیوا یکسانیت سے بھی اُداسی جنم لیتی ہے۔ اس کا سلسلہ دراز ہوتا جاتا ہے۔

فرید پربتی ہمارے ان شاعروں میں ہیں جو شعری روایت سے نہ صرف واقفیت رکھتے ہیں بلکہ وہ ہماری کلاسیکی شاعری اور اس کی بوطیقا سے حسب توفیق استفادہ بھی کرتے ہیں۔ ان کے ہاں نہ سراسر روایت پرستی ہے نہ روایت گزیدگی۔ شعری روایت کے شعور نے ان کے شعری ادراکات کو زیادہ سے زیادہ نکھارنے اور سنوارنے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ جمالیاتی شعری روایت سے آگہی کے ساتھ انہوں نے اپنی فطرت کے عین مطابق ملک کی عام تہذیبی، روحانی اور انسانی روایات واقدار کا بھی گہرا عرفان حاصل کیا ہے۔ جس کے سبب ان کے ہاں تہذیبِ نفس اور تزکیۂ نفس کے مرحلے آسان ہوئے ہیں ان کے ہاں کسی نوع کی بغاوت، نفرت یا غصے کا سراغ نہیں ملتا۔ اس کے برعکس ان کے ہاں ایک دانشورانہ استفہام اور ایک مسلسل حزنیہ آہنگ ملتا ہے جو شاعر کی دردمند روح، اس کی روحانی سوز وتپش اور زخموں کا پتہ دیتا ہے۔ اس عمومی تبصرے سے قطع نظر فرید پربتی جن اوصاف وخصوصیات کے سبب اس عہد میں اپنا امتیاز قائم کرتے ہیں وہ انکا پختہ لسانی شعور، استعارہ سازی اور تمثال سازی کا رجحان ہے جو ان کی اصل پہچان کا ذریعہ بنتا ہے۔ فرید پربتی زندگی اور اس کے مظاہر کا بڑی باریک بینی کے ساتھ مشاہدہ کرتے ہیں، جزیات پر دسترس کے سبب حقائق کے بطن میں پوشیدہ ابعاد کی شعاعوں کو گرفتار کرسکتے ہیں۔ ان متعدد دعوؤں کو پائے ثبوت تک پہنچانے کے لئے آیئے اب فرید پربتی کے اشعار سے، جو ان کی تازہ غزلوں سے منتخب کئے گئے ہیں، ہمکلام ہوں تاکہ گفتگو زیادہ معنی خیز ہوسکے۔ فرید پربتی نے غزلوں کے علاوہ

نظمیں بھی لکھی ہیں۔فرید پربتی کی غزلوں میں دیگر اوصاف کے علاوہ لفظی تضاد اور رعایات لفظی کے ذریعہ حسن کاری کا خاص اہتمام ملتا ہے۔اس کی کچھ مثالیں دیکھتے چلیں ۔

بجھی کچھی ہوئی سانسوں کا دے رہا ہوں حساب
سلگتی ریت کو رِم جھم ذرا نہ راس آئی

یہاں ''سلگتی ریت'' اور ''رِم جھم'' کے درمیان استعاراتی تضاد سے استفادہ توجہ طلب ہے۔ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں ۔

ناچے گا کبھی مور ترستے ہوئے دل کا
اک دن ترے الطاف کی برسات بھی ہوگی

یہاں ناچنا، مور اور برسات کے درمیان معنوی ربط مانوس استعارے اور رعایات لفظی سے شاعر کی خصوصی رغبت کے بھی مظہر ہیں یا ایک دوسرے شعر میں ۔

جب سے چراغِ یاد بجھا بادِ بے لحاظ
جینا محال ہوگیا ویرانی بڑھ گئی

'بادِ بے لحاظ' چراغِ یاد سے کس طرح دست و گریباں ہے اور اس بصری منظر کا لطف ویرانی کے ماحول میں کیا ہی عجب خوبصورت تجربہ ہے۔ یہاں بھی لفظی رعایت کا التزام موجود ہے اور پرانے اور نئے تجربے کا فرق بھی واضح ہے۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ 'باد' اور 'بادِ صرصر' شاعر کے محبوب استعارے ہیں جو اس کے تخلیقی وجدان کا ایک ناگزیر حصہ بن چکے ہیں۔

فرید پربتی کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو ۔

راہِ طلب میں گر کہیں درد کی اِک کرن ملے
پلکوں کی رہگذر سے دل میں اسے اُتارنا

'درد کی کرن' اور پلکوں کی رہگذر کی وساطت سے وجود میں آنے والی اس

مرئی تصویر سے شاعر کے تصورِ جمال کی رفعتوں کا سراغ مل جاتا ہے۔ پربتی ایک دوسری جگہ کہتے ہیں۔

نیند کے قافلے چلو ڈھونڈ لیں پھر نگر نگر
خوابوں کے عکس عکس کو جاگتے میں پکارنا

یہاں بھی بصری پیکروں کے ہجوم میں 'نگر' اور 'عکس' کی تکرار سے جو شعری موسیقی برآمد ہو رہی ہے اس سے شعر کی تاثیر میں اضافہ ہوا ہے۔

چھوٹی بحر کا یہ شعر بھی توجہ طلب ہے۔

ہر ایک احتجاج نقش آب کی طرح
ہر ایک اعتماد عکس خواب کی طرح

'نقش آب' اور 'عکس خواب' بھی شاعر کی جمال پرست روح کا اشاریہ ہیں ان پیکروں کی وساطت سے بننے والی تخیلی شاعرانہ فضا ہمیں تھوڑی دیر کیلئے مادی اور اسفلِ دنیوی علائق سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

فرید پربتی کے ہاں ایک میلان، جو اُن کے جمالیاتی فکر سے آمیز ہو کر بار بار سامنے آتا ہے وہ شدتِ غم کو Dilute کرنے کا عمل ہے۔

بطرزِ خاص ستم جو حنا حنا سا لگا
اسی سے درد کا رشتہ سجا سجا سا لگا

'ستم' اور 'حنا' کے درمیان مرحلوں اور رابطوں کا عرفان حاصل کیے بغیر 'رشتہ' درد کی معنویت کو سمجھنا دشوار ہے۔ ایک پرانے مضمون کو نئے عہد کی زبان میں جن استعاروں کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے اس سے حسیت کی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک دوسری جگہ فرید پربتی کہتے ہیں۔

سلگتے خواب خریدے ہیں نیند کے بدلے
یہ کاروبار پرانا نیا نیا سا لگا

یہاں 'سلگتے خواب' اور 'نیند' کے تلازمے خطۂ کشمیر کی موجودہ صورتحال

کے تناظر میں اور وجودی کشمکش کے لحاظ سے بھی معنی خیز ہیں۔ پربتی کے ہاں تجربات کی زرخیزی کا عمل ہر لحظہ نئی کیفیات کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔

بنے بنائے سے راستوں کو ڈھا گئی ہے ہوا
تمام نقشِ کفِ پا مٹا گئی ہے ہوا

قدیم اقدار کی پامالی اور بے بضاعتی کے ضمن میں 'ہوا' کا کردار بے حد معنی خیز ہے۔ بنے بنائے راستوں اور نقش کف پا، ہوا کی زد پر ہیں...... مٹ جانا ہی اُن کا مقدر ہے۔ شاعر اس منظر سے دل برداشتہ ہے اس لئے کہ تخریب کے بطن سے تعمیر کے آثار ہنوز ناپید ہیں۔

فرید پربتی کے یہاں زندگی کے عام مناظر سے شاعرانہ مواد اخذ کر لینے کا ہنر بے پناہ ہے۔

وہ کریدے ہے راکھ چولہے کی
اور نگاہوں میں خواب ہے بابا

لفظی رعایات کے دلدادہ پربتی کے ہاں اِن رغبتوں کے پس پُشت معنوی امکانات کی بھی کمی نہیں ہے۔ راکھ اور خواب یا نگاہوں میں خواب یا چولہے کی راکھ کے ساتھ کریدنے کا التزام شاعر کی ذہنی وابستگی کے غماز ہیں اور اپنی مجموعی کیفیت کے اعتبار سے نئی سوچ کا ایک پہلو بھی رکھتے ہیں۔

فنی اور جمالیاتی ابعاد و جہات کی حامل فرید پربتی کی شاعرانہ کائنات کے کئی اور پہلو بھی ہیں جن سے پربتی کے امتیاز کی نشاندہی ہوتی ہے۔ کہتے ہیں۔

یاد کے گہرے سمندر میں نہ ڈالو پتھر
دائرے کھینچتی ہے موجِ ہوا پانی پر

'یاد' اور 'گہرے سمندر' کے مابین معنوی ربط، پتھر، دائرہ، موج، ہوا اور پانی کی شمولیت سے لفظی رعایتوں کی ایک طویل زنجیر بنتی نظر آتی ہے۔ اس شعر کی تہہ سے اُبھرنے والی حرکی تصویر سطح آب پر ایک عجیب منظر پیش کرتی ہے۔ اسی

نوع کا ایک دوسرا تجربہ کچھ مختلف حسّی و جمالیاتی پیکروں کے ساتھ۔

اُداسیوں کے پرندے مُنڈیر پر رکھ کر
خموشیوں کے شجر صحن میں اڑا کے گیا

ایسا لگتا ہے جیسے ہجر زدہ گریز پا لمحات زندگی کے ساتھ دائمی نقوش بن کر فضا میں منجمد ہو گئے ہیں۔ منڈیر پر اُداس پرندے، صحن میں اُگے ہوئے خموشیوں کے شجر سے پوری فضا اپنی ادنیٰ تفصیل کے ساتھ لفظوں سے تعمیر شدہ شعری ہیئت میں ڈھل گئی ہے۔ یہاں اُداس پرندے اور خموشیوں کے شجر، شاعر کی اپنی ذات سے کس قدر مماثل ہیں۔ اس رفاقت میں ہی ایک دوسرے کی طاقت وطمانیت مضمر ہے۔

فرید پربتی کی شعری کائنات میں رومانی اور احساسی استعاروں کی کمی نہیں، ان کے شعری اسلوب کا تمام تر حسن انہیں خصوصیات واوصاف سے آشکارا ہوتا ہے۔

تجھ کو کیا دوں گا نہ خوشبو ہے نہ شبنم ہے نہ رنگ
میرے دامن میں بجز موجِ ہوا کچھ بھی نہیں

خوشبو، شبنم، رنگ اور موجِ ہوا وہ احساسی تتلیاں ہیں جن کا تعاقب کرنا شاعر کا مسلک ہے۔ اس نسبتاً صریح روایتی اسلوب میں بھی جدید زندگی سے ماخوذ ایک استعارہ ہے یعنی موجِ ہوا جس سے موجودہ عہد کے زرد چہرے پر روشنی پڑتی ہے، فرید پربتی کے نمائندہ اسلوب کی ایک خوبصورت مثال یہ شعر بھی ہوسکتا ہے۔

جنوں کے پاؤں تلے چڑھتی سیڑھیاں نہ نکال
حصارِ باغ سے خوش رنگ تتلیاں نہ نکال

'جنوں کے پاؤں' اور 'چڑھتی سیڑھیوں' سے تشکیل کردہ یہ تلازمہ اپنے اندر ایک عجیب ندرت رکھتا ہے۔ ان چڑھتی سیڑھیوں کی اصل استعاراتی معنویت اس تناظر میں ابھرتی ہے۔ جب ہم ان سیڑھیوں اور انتہائی بلند چوٹیوں کے

درمیان معنوی ربط کو محسوس کرسکیں ایک بظاہر حقیر اور بے جان لفظ استعارہ کی صورت میں کس طرح ایک کلیدی کردار ادا کررہا ہے۔ باغ اور خوش رنگ تتلیاں، اگرچہ پامالِ استعارے ہیں لیکن یہاں اپنی افادیت کا بھرپور جواز رکھتے ہیں۔

فرید پربتی کے شاعرانہ تجربات کی گوناگوں فنی و جمالیاتی ماہیت کے سلسلہ میں ایک آخری شعر ؎

فساد ہو نہ بپا پھر سکوں کے ساحل پر
اُداسیوں کے سمندر سے مچھلیاں نہ نکال

بظاہر یہاں بھی رعایات کا سلسلہ موجود ہے۔ ساحل، سمندر، مچھلیاں اسی رغبت کی مظہر ہیں۔ اسی طرح تضاداتِ لفظی سے بھی شعر خالی نہیں ہے۔ فساد، سکوں، اداسیوں کے بالمقابل مچھلیاں جن کے وجود سے حرکت عبارت ہے، متضاد کیفیات ہیں۔ تاہم یہ بات واضح ہے کہ فرید پربتی قدیم شاعرانہ تجربوں سے الگ ان معروف حربوں سے غیر معروف اور مانوس علائم سے نامانوس حقائق کی باز آفرینی کرتے ہیں۔ یہ شعر انہیں حربوں کے ایک خاص شاعرانہ استعمال کے سبب اس قدر خوشگوار اور تازہ ہیں۔

فرید پربتی کی شاعری کے اس مختصر سے مطالعہ سے اتنی بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ ہجوم میں کھو جانے اور بنے بنائے راستوں پر اندھا دھند چلنے کے بجائے اپنی بصیرت کی رہنمائی میں اپنی راہ خود بناتے ہیں۔ وہ شاعری میں فنی اور جمالیاتی اقدار کی قدر و قیمت سے نہ صرف یہ کہ کماحقہٗ واقف ہیں بلکہ ان اوصاف سے کبھی سمجھوتہ نہیں کرتے۔ حیرت ہے کہ فرید پربتی جیسے ہوش مند شاعر کے ہاں ذہنی ارتقاء کے نقوش اتنے مدھم کیوں ہیں؟ ان کے ہاں حسی تلازموں کی تکرار کیوں ہے۔ مناظر کی یکسانیت شاعری کے حق میں کسی طرح مفید نہیں ہوسکتی۔ امید ہے فرید پربتی اپنی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے آئندہ زیادہ امکانات اور زیادہ مؤثر قوتِ اظہار کے ساتھ سامنے آئیں گے۔

●□●

فرید نامہ......ایک جائزہ

پروفیسر احمد قدوس جاوید

دبستانِ کشمیر کی عصری اُردو شاعری کے معیار کا مستحکم جواز پیش کرنے والے شعراء میں فرید پربتی ایک اہم نام ہے۔

ابرِ تر (۱۹۸۷ء) آب نیساں (۱۹۹۲ء)، اثبات (۱۹۹۵ء) فرید نامہ (۲۰۰۳ء) فرید پربتی کی شاعرانہ ہنرمندی کا ثبوت فراہم کرنے کیلئے کافی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی مکمل شاعر کی طرح فرید پربتی کے یہاں بھی کم و بیش تمام مانوس اصناف سخن پر طبع آزمائی کی روشن مثالیں ملتی ہیں۔ ''فرید نامہ'' رباعیات کا مجموعہ ہے۔ پھر بھی کہا جاسکتا ہے کہ فرید پربتی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور غزل جیسا کہ معلوم ہے۔ روایات اور اجتہادات کے تمام تر مرحلوں سے گزر کر اپنی آج کی جدید تر صورت ہیں۔ معاشرتی اور ثقافتی مدوجزر کی مختلف النوع لہروں اور دائروں کیساتھ سامنے آنے والی وہ صنف سخن ہے جو شعر بہ شعر اُردو شاعری کے لسانی، معنیاتی اور جمالیاتی نظام کے امکانات کو زیادہ سے زیادہ روشن اور وسیع کر رہی ہے۔ چنانچہ فرید پربتی کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک بات شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ فرید پربتی کی شاعری، اردو شاعری کی مضبوط و مستحکم روایت پر اپنی اساس رکھتی ہے۔ یہ بات آج کے چند دیگر شاعروں کے یہاں بھی نظر آتی ہے۔ لیکن دوسرے شاعروں کے یہاں، جہاں روایت کا احترام یا رشتہ، سابقہ شعراء

کے مضامین اور طرز بیان کی نقل اور تکرار کی صورت میں سامنے آتا ہے وہیں فرید پربتی کے یہاں یہ امتیاز، اساتذہ کے غیر معمولی لسانی شعور اور اظہار و بیان کے مثالی نمونوں (Patterns) کی گہری واقفیت کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ فرید پربتی کے یہاں عام طور پر Conventional اور Referential معانی سے الگ الفاظ کا جو تازہ کار لسانی برتاؤ ملتا ہے اسکے سبب فرید پربتی کی شاعری ایک طرف تو کلاسیکی اُردو شاعری کے لسانی و اظہاری امتیازات سے اپنا رشتہ قائم کرتی ہے دوسری طرف سوچ اور فکر کو تخلیقی تجربہ کے بطور شعر میں پیش کرنے کی ہنرمندی کے سبب جدید ترین لسانی برتاؤ، معنوی پہلوداری اور فنی و جمالیاتی رویوں کا جواز بھی پیش کرتی ہے۔ اس کا اندازہ فرید پربتی کی غزلوں کے اس طرح کے اشعار سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

اب اسی شہر میں کرتا ہوں طلب جائے اماں
لوگ جس شہر سے جان اپنی بچا کے نکلے

کل تلک تول رہے تھے یہی پھولوں میں مجھے
آج کیا بات ہے آمادۂ خنجر نکلے

اس درجہ بڑھے نقل مکانی کے یہاں شغل
تعمیر کہیں پر بھی مکاں کر نہیں پائے

کیوں نہ قیمت خود شناسی کی بڑھے
آئینے بننے لگے دشت و سراب

دور لگتا ہے مجھے پاس کا ہر اک منظر
پھیلتا جاتا ہے یہ کیسا دھواں ایک نیا

یوں تو کسی بھی شاعر کی شاعری کی قدر و قیمت اور امتیازات کا اندازہ براہ راست اس کی شاعری سے ہی لگایا جاسکتا ہے۔ اپنی شاعری اور شاعرانہ حیثیت سے متعلق شاعر کے ذاتی تصورات اور دعوؤں سے نہیں، پھر بھی اگر کوئی شاعر فن

شاعری کے ساتھ ساتھ خود اپنی شاعری کے بارے میں بھی ایک صائب رائے رکھتا ہے تو اس کی شاعری کو اس رائے کی روشنی میں دیکھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ چنانچہ ''فرید نامہ'' کے پیش لفظ میں، فرید پربتی کے ان جملوں کو ذہن میں رکھئے:

''شاعری کا منظر نامہ دلکش بھی ہے اور پیچیدہ بھی، اُفق شعر پر متعدد رنگ ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے گزرتے ہیں اور ہر رنگ کو اصرار ہے کہ وہی سب سے زیادہ سچا اور موزوں رنگ ہے۔ میرے نزدیک شاعری اظہار ذات کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ یہ اپنے اصل مفہوم کے لحاظ سے زمان و مکان کی حدود و قیود سے یکسر بالاتر ہوتی ہے۔ شاعری جدید ہے نہ قدیم بلکہ صرف شاعری، متنوع اظہار کے سانچوں کے باوجود یہ اپنی اصلیت کی دفاع کرتی ہے''۔

شاعری کی ''اصلیت'' کے بارے میں فرید پربتی کے خیالات بڑے خوبصورت، منطقی اور قابل قبول ہیں۔ دراصل شاعری سے متعلق کلاسیکی سوچ نئے قالب میں ڈھل کر ایسے ہی نکات تراش سکتی ہے۔ لیکن کیا کیجئے کہ فرید پربتی فطرتاً اول و آخر شاعر ہیں۔ شاعری کی ''اصلیت'' کے اسرار و رموز کی تفہیم اور برتاؤ کا شعور بھی رکھتے ہیں اور سلیقہ بھی۔ لیکن ان سے یہ توقع کرنا کہ اُردو شعریات کی تیزی سے بدلتی ہوئی لہروں اور بنتے بکھرتے دائروں کا تجزیہ بھی کرتے چلیں، ان کے حق میں زیادتی ہوگی۔ یہ کام ناقدین کا ہے اور تنقیدی نقطہ نظر سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کا جدیدیت کے فطری زوال اور پھر زبان و ادب، لفظ و معنی، اظہار و بیان متن میں معنی کی تخم ریزی اور متن سے اخذ معنی وغیرہ سے متعلق نئی تھیوریز کے بالواسطہ یا بلاواسطہ اثرات کے سبب اُردو شاعری میں بھی ہر سطح پر جو تازہ کار رویئے سامنے آرہے ہیں۔ انکی رو سے آج اردو شاعری کی وحدانی اور حتمی تصور کی قیدی نہیں رہ گئی ہے۔ اس کی ایک نمایاں وجہ یہ ہے کہ انٹرنیٹ، صارفیت (Consumerism) اور گلوبلائزیشن کے اس دور

میں مشرقی شعریات میں مغربی شعریات کی آمیزش نے اُردو شعریات کو بھی تشکیل جدید کی اُس نئی راہ پر گامزن کر دیا ہے جہاں ثقافت، زبان اور شاعری سے متعلق ہر تصور، ہر نظام اور ہر کلیے کے مد مقابل کئی کئی متبادل، تصور نظام اور کلّیے موجود ہیں اور ہر ایک کو صحیح یا غلط قرار دینے کے الگ الگ جواز کی بھی کمی نہیں۔ لہٰذا اُردو شاعری کی آج کی شعریات کو بوقلمونیت اور تکیثرت کو ذہن میں رکھتے ہوئے فرؔید پربتی (یا کسی بھی شاعر) کی شاعری کو محض ''اظہار ذات'' کی شاعری (پروفیسر ظہیر احمد صدیقی) قرار دینا یا یہ کہنا کہ فرید پربتی کی طرز فکر اور پیرائیہ بیان دونوں سطحوں پر منفرد ہے۔ دلبستگی کی خوبی رکھتی ہے اور چونکہ سوچ کر کہی گئی ہے اس میں گیرائی بھی ہے۔ (شمس الرحمٰن فاروقی) کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ ممکن ہے فرید پربتی اور ان سے محبت کرنے والوں کو اس طرح کے جملے پڑھ کر یا سن کر اچھا لگے لیکن ایسے چلتے ہوئے جملے ہیں جو اول تو آج کے کسی بھی غنیمت شاعر کے بارے میں کہا جا سکتے ہیں۔ دوئم یہ کہ ایسے جملے آج کی شاعری اور شاعر کو فطری اور بے محابہ اظہار کے منصب سے پیچھے ہٹانے کا سبب بھی بن سکتے ہیں۔ فرید پربتی کی اس رباعی پر غور کریں۔

بڑھتا ہے اب احساس زیاں روز بروز
جلتا ہے اِک آسودہ مکان روز بروز
بدلا ہے چمن بدلا ہے گلچیں کا مزاج
خوابوں کا یاں اڑتا ہے دھواں روز بروز

فرؔید نامہ میں اس طرح کی متعدد رباعیاں ملتی ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسی رباعیوں سے جو شاعری سامنے آتی ہے اس شاعری کو محض اظہار ذات کی شاعری قرار دینا فرؔید پربتی کی شاعری کے معنیاتی امکانات کو محدود کرنے کے مترادف ہوگا۔ کیونکہ فرید پربتی کے یہاں اس نوع کی رباعیاں بھی موجود ہیں۔

خاشاک وجود ایک بھنور میں رہتا
اے بے خبری اپنی خبر میں رہتا
سانسوں نے نہیں چھوڑی وظیفہ خوانی
مصروف میں کیا کارِ دگر میں رہتا

فرید پربتی کی اس طرح کی شاعری طرز فکر اور پیرایہ بیان دونوں کے اعتبار سے انفرادیت رکھتی ہے۔ اس میں گیرائی بھی ہے اور گہرائی بھی، لیکن اسے سوچ کر کہی گئی شاعری قرار دینا فرید پربتی کے ساتھ بے انصافی ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ فرید پربتی کی شاعری کا معتد بہ حصہ ایسا ہے جسے تخلیقی تجربات و تصورات کے آزاد فطری اور بے محابہ اظہار کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے ''فرید نامہ'' سے ہی ایک دو مثالیں دیکھئے

اِک رنگ شکستہ ہی صانع ہوتا
یاں جہد مسلسل میں یہ مانع ہوتا
بجھ کے رہ جاتی مری شورہ طلبی
میں موت یہ یا زیست پہ قانع ہوتا

اُڑتے ہوئے لمحات کی گردش اور میں
موہوم خیالات کی لرزش اور میں
رفتار ہے کج، پائے طلب کی شاید
بے سود شب و روز کی ورزش اور میں

جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے فرید پربتی اُردو شاعری کی روایات اجتہادات اور عصری مقتضیات کا گہرا شعور رکھنے والے ایک ہمہ جہت شاعر ہیں۔ ان کا شمار، عصری غزل میں عرفان صدیقی، اسعد بدایونی اور عبدالاحد ساز کے بعد آنے والے قابل لحاظ شعرا میں ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اکیسویں صدی کے اوائل میں وہ اپنی تازہ غزلوں کے مجموعے کے ساتھ سامنے آتے۔ لیکن

''فرید نامہ'' کو انہوں نے اپنی رباعیات کے لئے ہی مخصوص رکھا ہے غالباً اسکی وجہ یہ ہے کہ اکیسویں صدی کے آغاز تک آکر شاعرانہ اظہار کیلئے غزل کو تفویق حاصل ہوئی جبکہ نظم اور خصوصاً قصیدہ، مثنوی اور رباعی جیسی اصناف کی جانب سے تشویشناک حد تک بے توجہی برتی جارہی ہے۔ ایسی حالت میں رباعیات کا مجموعہ ''فرید نامہ'' رباعی گوئی کی رفتار تیز کرنے کا سبب تو بن ہی سکتا ہے۔ فرید پربتی کے شاعرانہ انفرادا اور اہمیت کا جواز بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ ایسا اسلئے بھی سوچا جاسکتا ہے کہ فرید پربتی نے غزلوں کی طرح رباعیاں بھی صنفی نزاکتوں، نئے تقاضوں اور جمالیات تہہ داریوں کا گہرا شعور حاصل کر لینے کے بعد ہی کہی ہیں۔ فرید پربتی نے ''فرید نامہ'' کے دیباچے میں ''رباعی'' کی ہیئت، تکنیک، تاریخ اور بنیادی فنی شرائط پر روشنی ڈالتے ہوئے بجا طور کہا ہے کہ ''اس صنف میں اختصار کے ساتھ جامعیت کی جو صفت نظر آتی ہے وہ دیگر اصناف میں مفقود ہے۔ رباعی مختصر صنف سخن ہے جس میں مقررہ اوزان، وحدت فکر اور تسلسل بیان کی پابندی از حد ضروری ہے''۔

فرید پربتی نے رباعی کی ابتداء سے متعلق، یعقوب بن لیث صفاری کے کمسن بچے سے منسوب مشہور روایت کو باطل قرار دیتے ہوئے واضح لفظوں میں کہا ہے کہ:

> ''رباعی شخصی ایجاد نہیں بلکہ لوک گیت کی نہایت ہی قدیم صنف ہے جو ترقی کر کے اعلیٰ شاعری کی صنف بن گئی ہے۔ اصل میں قدیم ایران میں ''ترانہ'' ایک صنف کی حیثیت سے رائج تھی۔ اس کا وجود ایرانی شاعری میں ظہور اسلام سے قبل بھی ملتا ہے۔ اس سے اس (رباعی) کے شخصی ایجاد کا قصہ بالکل فرضی معلوم ہوتا ہے''۔

صنف رباعی کے حوالے سے ''اوزان'' کی بحث جتنی اہم رہی ہے اتنی ہی نازک بھی۔ سحر اور زار نے رباعی کیلئے جو اوزان مقرر کئے ہیں۔ ان سے کہیں

اختلاف اور کہیں اتفاق کرتے ہوئے بعض دانشوروں نے جہاں ۲۴ ر اوزان کی قید لگائی ہے وہیں چند ایک عروض دانوں نے ارکان میں ردوبدل کی گنجائش کے حوالے سے رباعی کو ۲۴ ر اوزان تک ہی محدود رکھنے کی مخالفت بھی کی ہے۔ یہ ایک عرصہ تک ''لاحول ولاقوۃ الا باللہ'' کو رباعی کا بنیادی وزن مانا جاتا رہا ہے لیکن نئی تحقیقات کی روشنی میں یہ بھی کہا جارہا ہے کہ یہ رباعی کا بنیادی وزن نہیں ہوسکتا۔

فرید پربتی نے رباعی کے اوزان کا منبع ومخرج، بحر ہزج کو مانتے ہوئے کہا ہے:

''رباعی جس طرح ایرانی الاصل ہے۔ اسی طرح اسکے اوزان بھی ایرانی زاہیں اور اہل فن نے بحر ہزج (مفاعلین۔ چار بار) سے اختراع کئے ہیں...... وزن رباعی کے استخراج کے سلسلے میں جو بنیادی اصول مدنظر رکھا جاتا ہے وہ سبب پئے سبب، وتد پئے وتد ہے یعنی رکن اول اگر سبب پر ختم ہوجاتا ہے تو اگلا رکن بھی سبب ہی سے شروع کیا جائے گا۔ اسی طرح وتد پر ختم ہونیوالے رکن کے بعد والا رکن وتد ہی سے شروع ہوگا......اوزان رباعی کے سلسلے میں کل نو زحاف مختص کئے گئے ہیں۔''

خرب۔ کف۔ قبض۔ جب۔ ہتم۔ تخنیق۔ خرم۔ شتر۔ بتر

رباعی کے اوزان سے بحث کرتے ہوئے فرید پربتی نے ان کا تعلق ایران سے مخصوص ساز ''سنطور'' کی لحنوں سے قائم کیا ہے۔ اس ضمن میں فرید پربتی کے دعوے، رباعی کی ایجاد اور صنفی شناخت کے حوالے سے بحث کے نئے دروازے وا کرسکتے ہیں۔ فرید پربتی کے مطابق:

''رباعی سنطور پر گائی جانے والی صنف ہے۔ سنطور ثقیل آوازوں کا متحمل نہیں ہوسکتا......کئی عروضیوں نے اپنی تحقیق کے ذریعے رباعی میں نئے اوزان شامل کرنے کی کوشش کی ہے مگر انکی حیثیت ایجاد بندہ سے زیادہ کچھ نہیں، کیونکہ ان حضرات نے نہ ہی

''دستنبو'' دیکھا ہے نہ اسکی لحنوں سے حظ اٹھانے کا موقع ملا ہے۔ اس
لئے ان کا اجتہاد انہی تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے''۔

اُردو میں رباعی گوئی کی ایک شاندار روایت ملتی ہے۔ اس ضمن میں انیسؔ، یگانہ چنگیزی، رواں اناوی، امجد حیدرآبادی، جوش ملیح آبادی، آسی غازی پوری، فراق گورکھپوری، مانوس سہرامی، ولی الرحمٰن، ولی کاکوی، عطا کوی اور ناوک حمزہ پوری وغیرہ متعدد شعراء کے نام آتے ہیں۔ بعض شعراء کا بھی رباعی گوئی کی جانب متوجہ ہو رہے ہیں۔ لیکن رباعی کے تاریخی، فنی اور شعری مضمرات کے غیر معمولی شعور کے ساتھ رباعی کو برتنے کی جیسی فطری اور ماہرانہ مثالیں فرید پربتی کے مجموعہ رباعیات ''فریدنامہ'' میں ملتی ہیں ان کی بناء پر یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اُردو رباعیات کا کوئی بھی انتخاب فرید پربتی کی رباعیات کی شمولیت کے بغیر معتبر انتخاب کہلانے کا سزاوار نہیں ہوسکتا۔

●□●

صوفیانہ سوچ کا مظہر......فریدؔ

حقانی القاسمی

رات کے اندھیروں میں الاؤ کی طرح روشن اور برف سے ڈھکے ہوئے پربتوں پر 'لفظ چراغ' جب روشن نظر آتے ہیں تو روح میں ایک سرشاری کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مجھے پربتوں پر روشن قندیل فرید پربتی کے یہاں نظر آئی۔ ان کی شاعری پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوا جیسے شبد، چنار کے درختوں میں خیال کے سرخ سرخ پتے جھوم رہے ہیں اور ڈل جھیل میں سوچ کا خوبصورت عکس نظر آ رہا ہے۔ لفظوں کے سینوں میں معانی کی کانگڑی چمٹی ہوئی ہے۔ لفظ اور کاغذ بھیگتے نہیں بلکہ پانیوں میں اور بھی روشن ہو جاتے ہیں۔ شبدوں کے جب جھرنے بہتے ہیں تو نغمگی اور موسیقیت کا پرسُرور احساس پورے وجود میں دوڑنے لگتا ہے۔ اس وقت ایسا لگتا ہے جیسے شبد کے جھرنے میں معنی تیر رہے ہوں۔

فرید پربتی اپنے شعری طریق اور تخلیقی اظہار میں وحید و فرید ہیں۔ انہیں شعری روایت کی جمالیات کی آگہی ہے اور انسانی اقدار و روایات کا عرفان بھی ہے۔ درد و غم ان کے تخلیقی وجدان کا ایک اٹوٹ حصہ بن گئے ہیں۔ اس لئے ان کی شاعری میں وہ ساری آوازیں مل جاتی ہیں جو کسی ٹوٹے ہوئے زخمی دل سے آہ کی صورت ابھرتی ہیں۔ ''اثبات'' گو کہ رباعی کا مجموعہ ہے مگر اس میں فکر کا ایک دریا موجزن ہے۔ اثبات کے یہ وہ شاعر ہیں جنہوں نے ہماری دھڑکنوں کو ان

دھڑکنوں سے ملا دیا جو نفی کی نذر ہو گئیں۔ نفی و اثبات کے مقامات طے کرنے والے اس شاعر نے ہمیں اس ''سرمد'' سے بھی ملایا جو ایک صادق کردار ہے، ہمیشہ زندہ رہنے والا، سرمد کے مزار پر جا کر جو کچھ عرفان حاصل ہوتا ہے، ان کے تخلیقی وجدان کا حصہ بن جاتا ہے اور اس عرفان کی کرنیں ان کے شعروں میں جگمگاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ سرمد نفی میں مستغرق تھے۔ 'اثبات' کی منزل تک نہیں پہنچے تھے، انہوں نے لا الہ کی منزلہ سے آگے کی منزل طے نہیں کی تھی۔ الا اللہ ان کی نظر میں تمنا کا دوسرا قدم تھا۔ انہوں نے شبد اور ارتھ کے گہرے ارتباط کو محسوس کر لیا تھا۔ اس لئے شبدوں کے درمیان بھی انہوں نے منزلوں کے فاصلے کو محسوس کیا تھا۔ لفظوں کی معنویت اور حرمت کا سب سے بڑا استعارہ سرمد کا وہ قول تھا کہ میں ابھی لا الہ سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ ''سرمد کے مزار پر'' فرید پربتی کی بہت ہی پُر اثر تخلیق ہے۔ اس میں شاعر نہیں بلکہ ایک صوفی کا دل دھڑک رہا ہے۔

فرید پربتی کے تخلیقی اظہار اور سوچ کے رنگ بہت منفرد ہیں۔ انہوں نے رباعیوں کے علاوہ غزلیں بھی کہی ہیں اور بہت ہی خوش رنگ غزلوں میں شیرینی، موسیقیت نغمگی ہے اور آتش چنار کی طرح غزل کی للیما سرخ ہے۔

فرید پربتی کے اشعار صوفیانہ سوچ کے مظہر ہیں۔ فنا فی الشعر فرید فنا فی العشق کے مقامات کی سیر کراتے ہیں۔ اُن کا ذہن غیر مشروط ہے۔ اس لئے ان کا فکری تناظر بھی وسیع ہے۔ انہوں نے ''اثبات'' کے ذریعے عشق و عرفاں کی بہت سی منزلوں اور مقامات کو طے کیا ہے۔ فرید پربتی کی شاعری میں اثبات کا جو فکری اور جمالیاتی تناظر سامنے آیا ہے، وہ عام شاعروں سے مختلف ہے۔ اس اثبات میں نفی کی وہ منزل بھی روشن ہے جو انکشافِ ذات کا وسیلہ بنتی ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جس کو طے کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس غروب میں طلوع بھی مضمر ہے اور اسی طلوع میں غروب بھی۔ یہ احساس فرید پربتی کو بھی ہے کہ فنا بھی بقا ہے اور بقا میں فنائیت۔ اُن ہی کا شعر ہے ؎

وجود میرا بکھر چکا ہے، جنوں کے در سے خرد کے گھر تک
قدم قدم پر ہوں دفن میں ہی جگہ جگہ ہے مزار یارو

یہ صرف انکشافِ ذات کا شعر نہیں ہے بلکہ پوری کائناتی وحدت کو ایک انسان کی ذات میں سمو دینے والا شعر ہے اور کائنات کی تفہیم، ذات کی تفہیم پر ہی منحصر ہے۔ اقبال نے جو شعر کہا تھا ع

جہاں میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

وہ انہوں نے اسی تناظر میں کہا تھا اور فرید پر بتی نے بھی اسی احساس کو اپنے تخلیقی وجدان کا ایک حصہ بنایا ہے۔ فنائیت اور اثبات کے اس تخلیقی سفر میں ہمارے شعراء ابھی بھی نفی کی منزل میں کھوئے ہوئے ہیں۔ اثبات کے مقام تک نہیں پہنچے ہیں، پھر بھی جانے کیوں زعم کے شکار ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ایک ہی جست میں انہوں نے ساری منزلیں طے کر لی ہیں۔ ابھی اثبات کی منزل بہت دور ہے پہلے نفی کے مقام سے گزر کر تو دیکھیں...... فرید پر بتی کو اثبات کی منزل کا پتہ ہے۔ اس لئے انہوں نے 'اثبات' کے ذریعے دراصل اپنی نفی کا ایک تخلیقی شعری پس منظر پیش کیا ہے۔

●□●

فرید پربتی......ایک مطالعہ

جاوید آذر

ریاست جموں و کشمیر میں اردو شاعری کے میدان میں ایک نئی آواز کا اضافہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے اور نہ ہی شعری مجموعوں کی فہرست میں ایک نئے مجموعے کا اضافہ تحیر آمیز ہے۔ کیونکہ اردو شعروادب کا حلقہ اب اس قدر وسیع و عریض ہو گیا ہے جہاں نہ تو تحریک کی ضرورت باقی ہے اور نہ انگیخت کی۔ بلکہ نئی کلیاں ازخود چٹختی ہیں اور قافلۂ رنگ و بو کی بہار میں شریک حال ہوتی ہیں۔ پھر یہ الگ بات ہے کہ کن گلوں کی مہک شامِ جاں کو معطر کرتی ہے اور کون سی بو زمانے کی تیز ہواؤں میں حلول کر کے بے نام ہو جاتی ہے۔

فرید پربتی ریاست کے دبستانِ شعر کی ایک ایسی ہی آواز ہے۔ جس کے متعلق میں قطعاً یہ فیصلہ نہیں دوں گا کہ وہ اچھا شعر کہتے ہیں یا بُرا۔ وہ بھرپور کہتے ہیں یا ہلکا، اُن کا مذاق سنجیدہ ہے یا آوارہ، یہ فیصلہ کرنا تو اصحابِ نقد کا ہی کام ہے مگر میں اتنا ضرور کہوں گا کہ فرید اور ان کی شاعری کو میں نے گذشتہ بارہ تیرہ سال سے کافی قریب سے دیکھا ہے لہٰذا اُن کے بارے میں میری ایک جچی تلی رائے بھی ہے۔ فرید کو اس زمانے سے جانتا ہوں جب انہوں نے ابھی لکھنا شروع نہیں کیا تھا اور اسلامیہ کالج میں بزمِ ادب کی مجالس ادب سے تحریک لیکر اُنہوں نے اپنے احساسات کو قرطاس و قلم کے حوالے کرنا شروع کر دیا۔ اس زمانے میں ان کی

شاعری بھی وہی تھی جو ہر مبتدی کی ہوتی ہے۔ اُن کی راہ میں بھی وہی رکاوٹیں حائل تھیں۔ جو ہر نووارد کیلئے آزمائش کی حیثیت رکھتی ہیں مگر مستقل مزاجی، بے پناہ محنت اور جذبے کی شدت نے اُن کی مشکلات کو آہستہ آہستہ آسان کر دیا اور وہ بہت سے ایسے شاعروں سے بہتر اور عمدہ شعر کہنے لگے جو اکثر اردو کے رسائل و جرائد میں چھپتے رہتے ہیں اور مشاعروں میں داد وصول کر لیتے ہیں۔

فرید پربتی کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ انکی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی کے کافی قریب ہے۔ ان کی شاعری میں عصر حاضر کی تمام تلخیاں، محرومیاں اور بے معنویت ایک ایسے اظہار کے قالب میں ڈھلتی ہیں جو غزل کا مرغوب تر اظہار ہے انہوں نے میر، ناصر کاظمی، شکیب جلالی اور بانی کے لہجے سے یقیناً مثبت اثر لے لیا ہے مگر اپنی آواز کو ان اثرات کے وزن تلے دبنے سے بچا لیا ہے میں یہ تو نہ کہوں گا کہ فرید لہجوں کے اس مونتاژ میں اپنا علاحدہ لہجہ تراشنے میں کامیاب ہوئے ہیں مگر ان کی ہر غزل یہ اعلان کرتی ہے کہ وہ ایک منفرد لہجے کو تراشنے میں مصروف ہیں اور اگر ان کی یہ کوشش اسی طرح جاری رہی تو ضرور اپنے لئے ایک الگ لہجہ بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

فرید شاعری کی لفظیات کو گھسے پٹے انداز میں استعمال کرنے کے بجائے نئے نئے پیکر تراشنے کی کوشش کرتے ہیں۔ استعاروں اور علامتوں کو نئے نئے Shades کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ جیسے وہ خود کہتے ہیں ؎

سلگتے خواب خریدے ہیں نیند کے بدلے
یہ کاروبار پرانا نیا نیا سا لگا

ان کے اشعار میں عصری مسائل کا ردعمل نہایت ہی بے ساختہ اور خود رو ہے جو کامیاب شاعری کی بڑی ضمانت ہے وہ اپنی محدود Comitment کو اظہار کی سلاست روی میں سدِ راہ نہیں بننے دیتے ۔

خریدوں گا میں اب سایہ کہاں پر
کہ بکتی دھوپ ہے ایک اک دکاں پر
کرائے دار سے ہوشیار رہنا
کہیں قابض نہ ہو جائے مکاں پر

گھر میں بیٹھا سوچ رہا تھا مجھ سا دُکھی ہے گھر میں کون
چھت پر چڑھ کر میں نے دیکھا لگی ہوئی ہے گھر گھر آگ

اُس جگہ تم نے مجھ کو چھوڑ دیا
جس جگہ سبزہ ہے نہ پانی ہے
اب سلامت مکان ہے نہ مکیں
کیا یہی تیری پاسبانی ہے

ہم کہ محروم ہیں چراغ سے بھی
وہ کہ سورج کے بادشاہ ہوئے

بے سمتی اور خود گم گشتگی کے پیدا کردہ قنوطی زاویوں میں الجھی پھنسی زندگی جدید شاعری کا مرغوب ترین موضوع رہا ہے ان الجھے ہوئے نشیب وفراز کا حیاتی ردعمل اور ان سے پیدا ہونے والا داخلی تضاد ہی نئی شاعری کا موضوع فکر ہے۔ فرید زندگی کو قریب سے دیکھتے ہیں اس کے کرب کو محسوس کرتے ہیں اور تب کہیں جا کے اپنے تجربے کو نوکِ قلم پر لاتے ہیں۔ اگرچہ ان تجربات میں قطعیت نہیں مگر مسلسل تغیر پذیر اور ہر دم بدلتے ہوئے انطباقات کے اسی دور میں یہ قطعیت ضروری بھی نہیں۔

رنج کی بات کر رہے ہیں لوگ
حد سے آگے گزر رہے ہیں لوگ

کاغذی ناؤ یہ کیا پار اُتاریگی فریدؔ
خود کو نادان تماشا نہ بنا پانی پر

ماحصل سے بے یقیں کر کے فریدؔ
مرحلوں کا دردِ سر مجھ کو دیا

اُن کی شاعری میں بصری استعاروں کا غلبہ ہے جیسے سرو وچنار، دشت و سراب، آئینہ، سمندر، ستارے، دیوار، بگولہ، غبار، سائے بادباں، اوس، آندھی، درخت، پھوار، خاروخس، کشتی، کھیتی، مکان، پرندے، شاخ، برگ وشجر، ثمر، شمع، چراغ، کشکول، گھر، چولہا، سحاب، بھنور، تیغ وتبر، تیر وسناں، تیلیاں وغیرہ بصری استعاروں کا زیادہ استعمال اگرچہ اشعار کو بعض اوقات گراں بار بناتا ہے۔ مگر ان کا استعمال اگر مجمل اور چست انداز میں کیا جائے تو یقیناً یہ شاعری کے مشاہداتی پہلو کو جاندار بناتا ہے ان کا استعمال شعر کو سادگی اور گفتگو کا رنگ بخشتا ہے نیز پس پردہ جذبے کی شدت اور پیش پردہ ہیئتی تجربات کو تصویر بنا کر آنکھوں کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔

فریدؔ کو زبان وبیان اور عروض وآہنگ پر بھی عبور حاصل ہے۔ وہ جذبات کو فنی قیود کے باوجود برتنے کا بھرپور حوصلہ رکھتے ہیں اور مشکل ترین زمین میں بھی اپنی مخصوص رنگ وبُو کے پھول کھلانے پر قادر ہیں انہیں مشق سخن کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے مطالعہ کے ذوق سے بھی نوازا ہے جس سے انہیں اپنے تجربات کو دوچند کرنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

مختصراً فریدؔ پربتی کی شاعری ایک جنگلی ندی کی لااُبالی کیفیت کے مصداق ہے جو ناہموار اور کھُردری زمیں پر گزرنے کے باوجود اپنے آہنگ کو برقرار رکھتی ہے اور ہر گزرنے والے پل کے تغیراتی ساگر میں گرنے کے باوجود بھی اُسے فنا نہیں ہونے دیتی۔

●□●

اُردو رباعی اور فرؔید

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

رباعی، ایسی صنف سخن ہے جو اپنا مزاج آپ رکھتی ہے۔ رباعی شاعر سے ایک عمر کی مشق و مزاولت چاہتی ہے۔ یہ ہر کہہ و مہہ کے بس کی بات نہیں۔ ہمارے ہاں شاعر اپنی شعر گوئی کی ابتداء بالعموم غزل سے کرتے ہیں۔ اس کے قطعی برعکس رباعی پر اس وقت توجہ دی جاتی ہے جبکہ زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت اور فن پر خاطر خواہ دسترس حاصل ہو جاتی ہے۔ ادبی اور فنی دونوں زاویوں سے اچھی رباعی کہنے کیلئے تو شاعر کو فنی اور فکری دونوں اعتبارات سے بغایت پختہ کار ہونا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ بے حد نازک فن ہے۔ رشید احمد صدیقی نے غزل کے فن کو ریزہ کاری میں مینا کاری سے تعبیر کیا ہے۔ رباعی کا فن بھی کچھ ایسا ہی ہے اور اصنافِ سخن کے مقابلہ میں رباعی کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ مثنوی اور نظم جیسی اصناف میں کوئی قصہ بھی بیان کیا جاسکتا ہے، تشریح اور تفصیل سے بھی کام لیا جاسکتا ہے۔ وضاحت اور صراحت کی گنجائش بھی ہوتی ہے اور مافی الضمیر کے اظہار میں جزئیات بیان بھی ہوسکتی ہے۔ اس کے علی الرغم رباعی میں کوئی بات تفصیل سے بیان نہیں کی جاسکتی۔ کسی نظام فکر کے بارے میں گفتگو نہیں کی جاسکتی۔ اس صنف میں صرف نکات بیان کئے جاسکتے ہیں۔ رباعی تھوڑے میں بہت کہہ جانے کا فن ہے۔ پروفیسر سید وحید اشرف نے رباعی کو مثنوی، طویل نظموں اور غزل سے بھی

ممیّز کرتے ہوئے اس کی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے کہ ''اگرچہ رباعی میں وہ تفصیل نہیں ہوتی جو مثنوی اور طویل نظموں میں ہوتی ہے۔ لیکن یہاں وہ ابہام اور تہہ داری بھی نہیں ہوتی جو غزل کا خاصہ ہے اس لئے رباعی شاعر کی فکر اور شخصیت کی واضح عکاسی کرتی ہے''۔ فنی اعتبار سے رباعی گوئی زبان دانی میں کمال اور قدرتِ کلام چاہتی ہے۔ ہمارے ہاں فی زمانہ رباعی کے بارے میں فنی اور ادبی طور پر گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر سید وحید اشرف نے قابل لحاظ کام کیا ہے۔ انہوں نے رباعیات تو خیر کہی ہی ہیں فن رباعی پر بھی تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے بلکہ فارسی اور اردو کے رباعی گو شاعروں کے بارے میں سیر حاصل انداز میں لکھا بھی ہے۔ ان کی رباعیات کے مجموعوں کے ''پیش گفتار'' وغیرہ پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ رباعی گوئی کیسے احترام اور اہتمام کا فن ہے۔ پروفیسرِ وحید اشرف کی رباعیوں کے مجموعہ کا پیش لفظ لکھتے ہوئے ڈاکٹر سید محمد طلحہ رضوی برق نے لکھا ہے: ''فنی اعتبار سے رباعی ایک مشکل ترین صنف سخن ہے۔ اس کے قواعد وضوابط کا وقوف عام نہیں۔ یہ مخصوصین کا حصہ ہے۔ (۲۴) بحروں کی قید، قافیہ اور ردیف کا التزام، ارکان میں ''سبب پئے سبب و وتد پئے وتد'' کی پابندی، لطافتِ خیال کا پاس، علوِ فکر، پروازِ خیال، مضمون کی ندرت اور چوتھے مصرعے کی تیزی و برّش کہ کڑی کمان کا تیر معلوم ہو آسان کام نہیں''۔ ان قیود اور قدغنوں کی وجہ سے رباعی کہنے والے بیشتر شاعر اعتراضات سے بچ نہیں سکے۔ غالب کی رباعی پر بھی کڑی تنقید کی گئی اور اقبال کی رباعیات/ قطعات کو بھی نشانہ بنایا گیا۔ فنِ رباعی کی نزاکتوں کی سمت اشارہ کرتے ہوئے پروفیسر وحید اشرف ہی نے ''مقدمہ رباعی'' میں لکھا ہے: ''غزل یا دوسرے اصنافِ سخن میں اگر کوئی شعر کسی سبب سے معیار سے گر جائے تو بقیہ اچھے اشعار کی خوبیاں اپنی جگہ برقرار رہیں گی لیکن رباعی میں اگر چاروں مصرعے مربوط نہ ہوں یا کوئی مصرعہ خراب ہو جائے تو اس کا اثر پوری رباعی پر پڑتا ہے''۔ یہ ہیں رباعی کے فنی رموز و آداب جن کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ اسی

کے ساتھ یہ امر خاطر نشان ہے کہ اور کئی اصناف کی طرح اردو میں صنفِ رباعی بھی فارسی سے آئی۔ فارسی میں سحابی استر آبادی کو بایں وجہ فوقیت حاصل ہے کہ اس نے اپنی ساری عمر اس صنفِ سخن کے لئے صرف کر دی۔ فارسی کے دیگر رباعی گو شاعروں میں خیام، سرمد، جامی، حافظ، سعدی، بابا افضل کوہی، بابا طاہر عریاں اور ابوسعید ابی الخیر چند نمایاں نام ہیں جہاں تک اردو کا تعلق ہے اردو شاعری کا آغاز دکن سے ہوا اس لئے اور اصناف کی طرح سب سے پہلے دکنی شاعروں ہی کے ہاں رباعیات ملتی ہیں بعد ازاں شیر محمد خاں ایمان، احسن اللہ خاں بیان، سودا، انیس، دبیر، غالب، ذوق، فغاں، حالی، امجد، اکبر، محروم، جوش، فراق، شاد اور قتیل کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ ان میں انیس اور دبیر کو اس لئے امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے رباعیاں خواہ کتنی ہی کہی ہوں اس صنف کو رنگ و آہنگ، امتیاز اور اعتبار سے ہم آہنگ کیا۔ ویسے انیس کے ایک مجموعہ میں (۵۱۲) رباعیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ رباعی کے نازک اور مشکل فن ہونے کا اظہار یوں بھی ہوتا ہے کہ جو شاعر رباعی گو کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں ان کا رباعی کا سرمایہ کچھ زیادہ نہیں، محدود ہے جبکہ غزل گو شاعروں کے ایک نہیں کئی کئی مجموعے آپ کی ہماری نظروں کے سامنے سے گزر چکے ہیں۔ رباعی کے بارے میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس میں اخلاق اور تصوف کے مضامین باندھے جاتے ہیں۔ یہ بات ضرور ہے کہ اخلاق اور تصوف کے مضامین زیادہ تر رباعی میں ادا کئے گئے ہیں لیکن اس کی کوئی تخصیص نہیں، منظر نگاری، جذبات نگاری، محاکات اور فطرت نگاری کے اچھے نمونے بھی عام طور پر رباعی میں پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح حسن و عشق کے موضوعات پر بھی رباعی کا دامن خالی نہیں ہے۔

پہلے کے مقابلے میں اس میں کوئی شبہ نہیں رباعی گوئی پر کم توجہ دی جارہی ہے جس کی وجہ ظاہر ہے اس صنف کی فنی پابندیاں ہیں لیکن اس صنف کو آزمانے والے آج بھی خاصی تعداد میں مل جاتے ہیں۔ اس دور کے ممتاز رباعی گو شاعروں

میں جذب عالم پوری، امجد حیدر آبادی، فراق، جوش، جگن ناتھ آزاد، صاحب حیدر آبادی اور کالی داس گپتا رضا کے علاوہ شمس الرحمٰن فاروقی اور وحید اشرف بھی ہیں اور میں ان میں ایک نام کا خاص طور پر اضافہ کرنا چاہوں گا اور وہ نام ہے فرید پربتی۔

فرید پربتی کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ ہیں۔ ان سے برسوں قبل سرینگر میں ملاقات ہوئی تھی اور تھوڑی بہت گفتگو ہی کے بعد میں ان کی شعری صلاحیتوں، فنِ شعر پر ان کی دسترس اور اردو فارسی شعر و ادب کے ان کے وسیع اور گہرے مطالعہ کا قائل ہو چکا تھا۔ اس دوران فرید پربتی کے شعری مجموعے شائع ہوئے "ابر تر"، "آبِ نیساں" اور "اثبات"۔ ان مجموعوں میں رباعیات بھی شامل ہیں تھوڑی بہت۔ فرید پربتی نے شہزور کاشمیری کا انتخاب کلام بھی مرتب کر کے شائع کیا اور اب انہوں نے اپنی صرف رباعیات کا مجموعہ "فرید نامہ" شائع کیا ہے۔ فرید پربتی نے "فرید نامہ" میں رباعی کی ہیئت، اس کی ایجاد اور اس کے فن پر اظہار خیال کیا ہے۔ نیز اپنے مزاج پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ فرید، زبان اور عروض کے بنیادی نکات سے حتی الوسع واقفیت رکھتے ہیں۔ صوفی ماحول میں ان کی تربیت ہوئی، صوفی گھرانے میں انہوں نے اپنے شب و روز گزارے لیکن انہوں نے نہ تو عروض دانی کو اپنی شاعری پر حاوی ہونے دیا اور نہ تصوف کو۔ ہاں اپنے شخصی پس منظر کے باعث ان کی رباعیات پر تصوف کا رنگ غالب ہے۔ فنافی الشعر فرید، فنافی العشق کے مقامات کی سیر کراتے ہیں ان کا ذہن غیر مشروط ہے اسلئے ان کا فکری تناظر بھی وسیع ہے۔ انہوں نے اثبات کے ذریعہ عشق و عرفان کی بہت سی منزلوں اور مقامات کو طے کیا ہے فرید پربتی کی شاعری میں اثبات کا جو فکری اور جمالیاتی تناظر سامنے آتا ہے وہ عام شاعروں سے مختلف ہے۔ اس اثبات میں نفی کی وہ منزل بھی روشن ہے جو انکشاف ذات کا وسیلہ بنتی ہے"۔ فرید نامہ میں لگ بھگ (۲۰۰) رباعیات ہیں۔ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، شمس الرحمٰن فاروقی، کرشن کمار طور اور پروفیسر بشیر احمد نحوی نے بھی فرید پربتی کی رباعیات پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان کو سراہا ہے۔

فریدؔ پربتی نے حمدیہ رباعیات بھی تحریر کی ہیں، شہر آشوب کے تحت بھی۔ اخلاقی اور صوفیانہ موضوعات پر بھی انہوں نے اظہار خیال کیا ہے اور حسن و عشق کے موضوعات پر بھی۔ انہوں نے صنفِ رباعی کو کسی خاص موضوع کے حوالہ نہیں کیا۔ ان کے ہاں موضوعات کا تنوع ہے۔ ان کی رباعیاں فہم کی زد میں ہوتی ہیں اور قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں۔ کلاسیکی ادب پر غیر معمولی نگاہ ہونے کی وجہ سے فریدؔ پربتی نے اس صنف کو بڑے سلیقہ سے برتا ہے۔ انہیں الفاظ کے انتخاب کا بھی سلیقہ ہے۔ فن رباعی کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے انہوں نے نہایت دلکش اور پیاری رباعیاں کہی ہیں۔ کرشن کمار طور نے خوب لکھا ہے: ''ڈاکٹر فرید پربتیؔ کی رباعیاں ذہن کی اطرافی عبارت اور جودت سے نہ صرف معمور ہیں بلکہ ان میں خلاقی کی وہ تیزی، توانائی اور تندی بہ صراحت موجود ہے جو کسی فن پارہ کو تیز فہم اور زیرک احتیاط سے صیقل کرتی ہے۔ ان کا بیان دانش مندانہ واقعیت پسندی سے مملو ہے''۔ رباعی گوئی پر کسی نہ کسی وجہ سے کم توجہ کے دور میں فرید پربتی کا اس اہتمام سے رباعی کہنا اردو شاعری کیلئے فالِ نیک ہے یقین ہے فرید پربتی کی رباعی گوئی پر توجہ برقرار رہے گی اور وہ اس صنف میں امتیازی مرتبت پائیں گے۔ ''فرید نامہ'' رباعیات کا بلاشبہ وقیع مجموعہ ہے۔ چند رباعیات :

شیرازہ محبت کا پریشان ہوا — شیرازہ محبت کا پریشان ہوا
اس دور میں جیتا ہوں کہ جس میں انساں — وحشی و درندہ اور حیوان ہوا

سر تا بہ قدم جوڑ گئے پھول ہی پھول — ہر شاخ سے وہ توڑ گئے پھول ہی پھول
نازک سا بدن ہونٹ گلابی اس کے — تا حدِّ نظر چھوڑ گئے پھول ہی پھول

نظارہ رہ گیا چشم تماشا بھی گئی — خواہش کی قسم، دل کی تمنا بھی گئی
پھینکا وہ فلاسنگ فلک نے پتھر — سامانِ طرب عیش کی دنیا بھی گئی

●□●

صاحبِ طرز شاعر......فریدؔ پربتی

پروفیسر محمد زمان آزردہ

فرید پربتی ایک نوجوان محقق ،تنقید نگار اور صاحب طرز شاعر ہیں انہوں نے بڑے کم وقت میں اپنی متانت اور سنجیدگی کا احساس دلایا ہے۔شہہ زور پر اُن کی کتاب شائع ہو چکی ہے۔ دو شعری مجموعے ابر تر اور آبِ نیساں منظر عام پر آچکے ہیں۔شاہ حاتم دہلوی پر اُن کے پی ایچ ڈی کے مقالے کو......اور محققین نے سراہا ہے۔اب اُن کے رباعیات کا مجموعہ ''اثبات'' منظر عام پر آنے والا ہے ان کا مختصر ادبی سفر ایک خوبصورت منزل کی بشارت دیتا ہے۔ متذکرہ بالا کتابوں کی اشاعت اُن کی لگن، مستقل مزاجی اور انتھک کوشش پر دلالت کرتی ہے۔ زیر نظر مجموعہ اُن کی محنت اور متانت کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

رباعی کا فن بہت مشکل ہے، اس فن میں بڑے بڑے سور ماؤں نے ٹھوکر کھائی ہے، بجائے خود رباعی کی دنیا میں قدم رکھنا برہنہ پا ایک خارزار میں پاؤں رکھنے کے مترادف ہے۔ یہ کوشش ہی بلند ارادے اور خود اعتمادی کا پتہ دیتی ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ اس خارزار سے فریدؔ پربتی نہایت احتیاط سے گزرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گو کہ پیر زخمی نہیں لیکن آبلہ پائی سے اس عالم میں کون بچا ہے۔ پڑھنے والوں کے حسن توجہ سے اُن آبلوں کا مرہم ہوسکتا ہے۔ خود کہتے ہیں۔

پرشور کبھی ظلم کے بازار میں ہوں
اور رقص کناں حسن کے دربار میں ہوں
پستی ہے مگر وقت کی چکی مجھ کو
ہاں تیز قدم وادئ پُرخار میں ہوں

اپنی خود اعتمادی، جرات رِندانہ اور جواں روی کا آئینہ یوں دکھاتے ہیں۔

پروانہ صفت آتشِ طور میں جل
خاک رہ جانا نہ کو منہ پر مل
گر عشق عناں گیر نہ ہو کیفِ حیات
کچھ بھی نہیں دیتا ہے خبر اندازِ خلل

فریدؔ پربتی نے اس مجموعے کے مشمولات میں ایک ساتھ ساری تمنائیں پوری کرنے کی جست کی ہے مگر ''کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد'' کے مصداق اب بھی ان کو بہت آگے جانا ہے۔ نشاناتِ راہ، سنگ پائے مزار، کوائف قلب مجروح، نا آسودگی روزگار اور اس طرح کی بہت سی چیزوں اور باتوں نے ان کے مضامین میں تنوع پیدا کر دیا ہے جو بہر حال ایک زندہ اور غیر مقید ذہن کی علامت ہے فرید عمل کی اصلیت کو نیت کے آئینے میں دیکھ کر قاری کو متاثر کرتے ہیں۔

ہے محو عبادت شیخ اب شام و پگاہ
غماں پر نظر اور ہے حوروں پہ نگاہ
اللہ کو سمجھتا ہے یہ حور فروش
لاحول ولاقوۃ الا باللہ

●□●

فرید پربتی......غزل کے آئینے میں

قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی

فرید پربتی ادب کے اُن پرستاروں میں سے ہیں جنہوں نے بیک وقت شعر ونثر دونوں میں اپنی جولانئ طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔ ہماری ادبی روایت میں Versitility کی مثال زیادہ نہیں ملتی۔ فرید پربتی کو پڑھ کر خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جنہوں نے بیک وقت ایک بہت اچھے شاعر اور نثر نگار کی حیثیت سے اپنی انفرادیت اور شناخت قائم کی۔ خلیل صاحب کے ساتھ فرید کا ذکر یوں بھی مناسب لگتا ہے کہ دونوں نے غزل سے نسبتاً زیادہ سرور کار رکھا ہے لیکن نظم بھی کہی ہے اور نثری مضامین کی حد تک صرف ادبی تنقید لکھی ہے۔ فرید نے رباعیات بھی لکھیں جس کے فنی و تخلیقی تقاضے خاصے مشکل سمجھے جاتے ہیں۔ خلیل صاحب نے بہت اہم منتخب اور اچھوتے موضوعات پر کافی غور وخوض کے بعد اپنے خاص انداز میں نہایت دلچسپ اور کارآمد تنقیدی مضامین لکھے جن سے اردو تنقید کو نہ صرف فائدہ ہوا بلکہ تازگئ فکر و خیال کی حد تک تنقید کی روایت میں اضافہ بھی ہوا۔ فرید نے بھی قدیم وجدید ادب کے گہرے مطالعے اور سنجیدہ تفہم کے نتیجے میں بعض بہت اہم اور قابل قدر مضامین لکھے جن سے ادبی تنقید کے سرمائے میں بہت اضافہ ہوا۔ فرید پربتی کی دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ جزوقتی ادیب یا شاعر نہیں بلکہ مسلسل اور لگاتار وہ پورے انہماک اور تندہی کے ساتھ اپنے ادبی ذوق کی

آبیاری میں مصروف ہیں۔ اپنے اس سنجیدہ اور کسی قدر ہمہ جہت ادبی شغف کے اعتبار سے سرزمین کشمیر میں یقیناً وہ اس روایت کے امین اور پیرو کہے جاسکتے ہیں، جس کی اعلیٰ ترین مثال حامدی کاشمیری ہیں جو اپنی بے پناہ دانشورانہ اور خلاقانہ صلاحیتوں اور کارناموں کے سبب برصغیر کے ممتاز ترین ادبی شخصیتوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

فرید پربتی چونکہ پچھلے پچیس تیس برسوں سے لگاتار لکھ رہے ہیں اور ان کے چند شعری مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں، میں نے ان کے مجموعہ آبِ نیساں کے حوالے سے اپنے ٹوٹے پھوٹے خیالات کا اظہار پہلے بھی کیا تھا جیسا کہ میں شروع سے محسوس کرتا ہوں فرید پربتی نے کشمیر میں رہتے ہوئے وہاں کے سیاسی و سماجی منظرنامے کا ایک حصہ ہوتے ہوئے بھی خود کو صرف کشمیر کی حد تک محدود رکھنا پسند نہیں کرتے۔ اس کے برعکس وہ اپنی شناخت پورے ملک بلکہ وسیع تر کائنات اور اس کے لامحدود افکار و علائق سے قائم کرتے نظر آتے ہیں اس لحاظ سے ان کے یہاں ایک آفاقی شعری تناظر کی بھی نشاندہی کی جاسکتی ہے دوسرا پہلو جو اس شاعری خصوصاً غزل اور اس کی صنفی خصوصیات کے حوالے سے ابھر کر سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ شاعری حالات حاضرہ پر تبصرہ کرنے اور Partision کردار ادا کرنے کے بجائے نسبتاً Neutral انداز کی حامل ہے جو اپنے قاری کو فکر کے خاص زاویئے میں مقید کرنے کے بجائے اس کو کھلا چھوڑ دیتی ہے تاکہ وہ خود فیصلہ کرے اور کسی نتیجے پر پہنچے۔ فرید پربتی کا زیر نظر مجموعہ ''گفتگو چاند سے'' بالعموم غزلوں پر مشتمل ہے۔ اس میں شہر آشوب بھی شامل ہے جو نظم ہونے کی حیثیت سے بعض ناگزیر فوری زمانی و مکانی حوالوں سے معمور ہے۔ مجموعہ کا عنوان گرچہ رومانی ہے لیکن شعری کائنات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ رومانس کسی محدود معنی میں نہیں ہے اس میں وسعت اور فراخی ہے یہ زندگی اور اس کے بے شمار مظاہر و ممکنات سے گہرے تعلق اور سروکار سے عبارت ہے۔ شاعری اور وظیفہ عشق انہیں

معنوں میں لازم وملزوم ہیں کہ یہ وہ مرحلۂ شوق ہے جس سے دامن کشیدہ گزر جانا ممکن نہیں ہے۔ فرید پربتی اس رمز سے باخبر ہیں۔ شیفتگی کے اس وسیع تر تناظر میں ان کا یہ شعر دیکھیں ؎

کون آتا ہے میری راتوں کو کرنے معتبر
کون جاتا ہے مری شمعیں دھواں کرتا ہوا

راتوں کو معتبر اور شمعیں دھواں کرنے کی مختصر سی لفظیات خصوصاً آنے جانے کے افعال کے ذریعہ وصال و ہجر کے گہرے پیچیدے جذبات واحساسات کی مصوری استعارہ سازی اور تمثال سازی کی کیسی نایاب مثال ہے۔

شاعر کے عشقیہ واردات Encounters کی نمائندگی بعض دوسرے اشعار سے بھی ہوتی ہے ؎

دے رہا تھا کوئی رہ رہ کے صدا یاد آیا
رات چلتی تھی بہت تیز ہوا یاد آیا

اسی رستے پہ کبھی سب نے جلائے تھے چراغ
اسی رستے پہ کبھی میں تھا کھڑا یاد آیا

ربط پیدا اس قدر اس یارجانی سے ہوا
وہ خفا مجھ سے میں اپنی زندگانی سے ہوا

چہرہ پردے سے جو اس رشک قمر کا نکلا
ہر کوئی کہنے لگا چاند کدھر سے نکلا

پہلا شعر اپنے اسلوب کی نوافگنی کے سبب غضب کی کشش اور تاثیر کا حامل ہے جس میں تیز ہوا کے اضافے سے درد وکسک اور محزونی کی کیفیات شعر کو

مزید دلاویز بنا دیتی ہیں۔ تاہم بقیہ اشعار یقیناً روایتی طرز کے حامل ہیں البتہ نئے دور میں برملاء اور بے محابا اظہار عشق کی روایت کے سیاق میں شوخی، لگاوٗ اور سپردگی کا یہ سنبھلا ہوا انداز بڑا پُر لطف معلوم ہوتا ہے۔

فرید نے یہاں خواب کی معنویت بھی کافی غور طلب ہے دیکھیں دیکھیں یہ اشعار۔

ہر گھنے سایے کو بے نام و نشاں کرتا ہوا
وقت گزرا خواب میرے رائیاں کرتا ہوا

لے کے نکلا ہوں میں پھر سوختہ خوابوں کے جلوس
خود تماشائی بنوں خود ہی تماشا ہو جاؤں

یہ اشعار بھی گہری معنویت سے قطع نظر اپنے اسلوب کی ندرت اور پیرایہ اظہار کی دلآویزی کے سبب نظروں کو پابندِ حجاب کرتے ہیں چنانچہ وقت کے تناظر میں گھنے سائے کا بے نام ونشان ہونا خواب کا رائیگاں ہونا اور دوسرے شعر میں ''سوختہ خوابوں کے جلوس کا منظر'' جس میں خود شاعر کی اپنی ذات تماشا بھی ہے اور تماشائی بھی۔ شعری اظہار کی وہ نادیدہ صورتیں ہیں جو ہم عصر شعری منظرنامے میں دور سے پہچانی جاسکتی ہے۔ فرید پربتی کے یہاں شعری تجربات کی بعض دوسری صورتیں بھی ملتی ہیں، جو ان کے فنی وفکری امتیازات کی نمائندگی کرتے ہیں۔

تنہا ہوں چار سمت ہے یلغار تیرگی
میں اِک چراغ ہوں تہہ داماں نہ رکھ مجھے

مقام و صبر و رضا ہو کہ راہ حق کی تلاش
حسین ابن علی کا ہے قافلہ آگے

غموں کے موسم گزر چکے تھے
نہ جانے پھر کیوں اُداس تھا میں

خود ہی رکھتا ہے دیے تیز ہوا کی زد پر
اور آندھی سے خبردار بھی کر دیتا ہے

ان اشعار کی وساطت سے شاعر کی منفرد فنی و تخلیقی بصیرت، گہرے جمالیاتی شعور اور احساس اور روحانی اضطراب کی بڑی خوبصورت ترجمانی ہوئی ہے۔

ان جستہ جستہ اشعار کے جائزے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ فریدؔ پربتی ہمارے ان شاعروں میں ہیں جو ایک آفاقی وژن رکھتے ہیں نبض کائنات پر ان کی انگلیاں اس انداز سے پڑتی ہیں کہ وہ زندگی کی تھرتھراہٹوں کو محسوس کر کے آلام کی عقدہ کشائی پورے وثوق کے ساتھ کرتے چلے جاتے ہیں۔ خدا کرے اس سرزمین تخلیق سے نغمے یونہی اُبلتے رہیں اور قلب وجگر کی وادیاں سیراب ہوتی رہیں۔

''گفتگو چاند سے''

عبدالاحد ساز (ممبئی)

ہماری موجودہ شاعری میں زیادہ تر اصرار یعنی موضوع و خیال پر کیا جا رہا ہے۔ اور پختگی کلام زبان و بیان کی چستی اور دیگر فنی محاسن کو ثانوی حیثیت دی جانے لگی ہے۔ حالانکہ شاعری محض فکر و احساس کی ترسیل کا نہیں بلکہ فنکارانہ ترسیل کا بھی نام ہے۔ شاعری کو تخلیقی عمل کی رو سے دیکھنے والے بیشتر ناقدین اور خود شعراء اس نکتے سے متفق ہیں کہ شاعری خیال سے نہیں، الفاظ سے کی جاتی ہے اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر فرید پربتی ۱۹۸۰ء کی دہائی میں متعارف ہونے والے شعراء میں ایک مخصوص حیثیت رکھتے ہیں کہ ان کے یہاں مشترکہ عصری فکر و احساس کے اظہار کے ساتھ ساتھ، پختہ کلامی اور الفاظ کے انتخاب، برتاؤ اور در و بست پر خاصی توجہ نظر آتی ہے۔ ان کے زیر نظر شعری مجموعے ''گفتگو چاند سے'' کی غزلوں میں قدرتِ کلام اور فنکارانہ روی کی ایسی مثالیں جابجا مل جاتی ہیں۔

دوشِ ہوا پہ کاغذِ آتش زدہ ہوں میں
خاشاکِ صبح و شام پہ رقصاں نہ رکھ مجھے

نہیں رہنے دیا کبھی ایک جگہ مرے حد سے زیادہ جنوں نے مجھے
ہوں اسیر گماں نہ ہی صیدِ یقیں مرا شوق ہزار طریق رہا

اور غزل کی زمینوں اور قوافی و ردائف کی ایسی ندرتیں بھی۔

رفاقتوں کی زیاں کوشیوں سے بچ کر چل
وہ کہہ رہا ہے سیہ پوشیوں سے بچ کے چل
خود سے نہیں مانوس ہوں ، حیران ہوں
ملتا کفِ افسوس ہوں ، حیران ہوں

اور یہ استطاعت روایت کے کماحقہ شعور، مطالعے اور پاسداری کے بغیر نہیں نصیب ہوسکتی، جس کی غمازی اس نوع کے اشعار سے بھی ہوتی ہے ۔

نثار کیا میں کروں کچھ نہیں بہم شاہا
گرفتہ دل ہوں ، میسر ہے چشم نم شاہا
غنیم ایک طرف ہے ، حلیف ایک طرف
مجھی میں پڑنے لگا رَن عجیب آخر شب

''گفتگو چاند سے'' فرید پربتی کا پانچواں شعری مجموعہ ہے اس سے پہلے ''ابرتر''، ''آبِ نیساں''، ''اثبات'' اور رباعیوں کا مجموعہ ''فرید نامہ'' شائع ہو چکے ہیں ان کے کلام میں فنی محاسن کے علاوہ جو موضوعات و محسوسات ہیں ان میں کشمیر کی رومان پرور فضا سے اخذ کردہ حسن و عشق کے اظہاریئے بھی ہیں کشمیر پر طاری سیاست کے عذاب ناک سایوں کا بیان بھی ہے اور دیگر عمومی عصری علائق بھی ۔ پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی نے اس کتاب کے دیباچے میں ایک بڑی پتے کی نشاندہی کی ہے:

''یہ شاعری حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرنے اور Partision کردار ادا کرنے کے بجائے نسبتاً Neutral انداز کی حامل ہے، جو اپنے قاری کو فکر کے خاص زاویئے میں مقید کرنے کے بجائے اس کو کھلا چھوڑ دیتی ہے تا کہ وہ خود فیصلہ کرے اور کسی نتیجے پر پہنچے''

اس ضمن میں عصری ادراک و احساس سے پُر یہ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

وہ کوئی دوست ہے میرا کہ دشمن جانی
ڈرا رہا ہے جو آبِ حیات سے مجھ کو
اُس ایک بوجھ سے جھکنے لگے میرے شانے
جس ایک بوجھ سے اب تک رہا میں سرخم بھی
سہہ رہا ہوں میں دیر سے لاسمیت کا اِک عذاب
کٹ گیا اپنوں سے خود کو آسماں کرتا ہوا

●□●

ہزار امکاں......ایک اور شعری سوغات

پروفیسر احمد قدوس جاوید

شاعر کوئی بھی ہو۔اسکے شناختی انفرادو امتیاز کا تعین ایک دُشوار گذار عمل ہے لیکن معاملہ یہ ہے کہ اس پل صراطِ معنی سے گذرے بغیر یہ اندازہ لگایا بھی نہیں جاسکتا کہ کس دور میں کن شاعروں نے عصری ثقافتی تقاضوں کے مطابق، فنی و جمالیاتی، لسانی و معنیاتی اعتبار سے اُردو شاعری کی شعری جمالیات کی تشکیل وتوسیع جدید میں کونسا کردار ادا کیا ہے۔ ہاں مگر شرط یہ ہے کہ شاعر کی شاعری میں کوئی ایسی شان، حکمت یا جادو ضرور ہو جو صاحبانِ نظر کو شعر کی گہرائیوں میں اُترنے پر مجبور کردے۔

اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو فرید پربتی کی شاعری اپنے مطالعہ و محاسبہ کا جواز بہرحال رکھتی ہے۔نئی نسل میں شعر کہنے والے تو بہت ہیں لیکن ایسے جو واقعی عمدہ اور امکانات سے پُر شاعری کررہے ہیں ان میں فرید پربتی اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔اس منفرد شناخت کے کئی اسباب ہیں اول یہ کہ فرید پربتی شعر کے منصب سے واقف ہیں۔مختلف و متضاد روایات و تجربات اور تحریکات و رجحانات کو برتتے ہوئے اُردو شاعری آج جس مقام تک پہنچی ہے فرید پربتی اس مقام اور اس کے تمام جہات و امتیازات کا گہرا شعور رکھتے ہیں اسی لئے فرید پربتی کی شاعری میں لسانی و شعری تہہ داری اور فکری و جمالیاتی پہلوداری کے ایسے اور اتنے نمونے ملتے ہیں جو ان کے کم ہی ہم عصروں کے یہاں نظر آتے ہیں۔

فرید پربتی کم و بیش بیس برسوں سے مشقِ سخن کررہے ہیں۔اس عرصہ میں

انہوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا اظہار اُردو شاعری کی تقریباً تمام اصناف اور ہیتوں میں کیا ہے لیکن بغور دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ بنیادی طور پر ان کے شاعرانہ جوہران کی غزلوں اور رباعیوں میں کھلتے نظر آتے ہیں۔

اَبرِ تر (۱۹۸۷ء) آب نیساں (۱۹۹۲) اثبات (۱۹۹۵ء) فرید نامہ (۲۰۰۳ء) اور گفتگو چاند سے (۲۰۰۵ء) کے بعد ''ہزار امکاں'' فریدؔ پربتی کے آسمان شعر کا ''چھٹا در'' ہے جہاں فرید پربتی کی تازہ ترین غزلوں، نظموں اور متفرق اشعار کا وافر ذخیرہ نظر آتا ہے۔ اس چھٹے در کے اندر داخل ہو کر اگر موضوعاتی، ہیتی، لسانی اور جمالیاتی محاسن کے حوالے سے فریدؔ پربتی کے شاعرانہ انفرادو امتیاز کا تجزیہ کریں تو صاف معلوم ہوگا کہ فرید پربتی اپنی شاعری کے اس مقام پر کھڑے ہو کر واقعتاً اُردو شاعری کا ساتواں در کھول رہے ہیں۔

فرِید پربتی نے اپنے اس تازہ ترین شعری مجموعہ کا آغاز بھی حمدیہ اور نعتیہ اشعار سے کیا ہے۔ یوں حمد اور نعت روایتی اصناف ہیں پھر بھی چونکہ خدا اور رسول پاک، ہر مقام، معاشرہ، عصر اور ثقافت کیلئے ابدی اور اصلی حقیقتیں ہیں اس لئے ہر زباں، زمانہ اور تہذیب کے اندر فطری تغیرات کے باوجود حمدیہ اور نعتیہ اشعار کا ظہور ہوتا ہی رہا ہے۔ خصوصاً مشرق کی اسلامی ثقافت سے رشتہ رکھنے والی زبانوں کے حوالے سے یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے۔ فریدؔ پربتی نے اپنے سبھی شعری مجموعوں میں حمدیہ اور نعتیہ اشعار اہتمام کے ساتھ شامل کئے ہیں اور اس سے فریدؔ پربتی کی ثقافتی بنیادوں کا اندازہ لگانے میں مدد ملتی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ فرید پربتی نے حمدیہ اور نعتیہ افکار و خیالات کا اظہار دل کی گہرائی سے جدید ترین لسانی و تخلیقی شعور کیساتھ کیا ہے۔ اس کا اندازہ درج ذیل اشعار سے لگایا جاسکتا ہے

حمد یہ اشعار

سمیع کہنا ، بصیر کہنا ، علیم کہنا ، حکیم کہنا
وہ اپنی عظمت سے خود ہے واقف اُسے تو ربِ عظیم کہنا

نوازشیں کیا، عنایتیں کیا، ہے باغ و بن کی روش روش پر
گلوں کو نکہت، کلی کو رنگت، عطا ہے کس کی نسیم کہنا

نعتیہ اشعار

جب سخن آپؐ بہ شیریں رطبی کرتے تھے
خوش نوایان چمن اپنی نفی کرتے تھے
کوئی پتّھر بھی اگر مارے دعا دیتے ہیں
یہ وہی کام ہے جو پیارے نبی کرتے تھے

میں نے فرید پربتی کے بارے میں پہلے بھی لکھا ہے کہ فرید پربتی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور غزل وہ صنف سخن ہے جس میں عصری تہذیبی اور معاشرتی روایات اور تقاضوں کا اظہار جمالیاتی زبان میں ہوتا ہے۔ لہٰذا روایات اور اجتہادات کے مختلف ومتضاد مرحلوں سے گذر کر آج کی غزل بھی معاشرتی اور ثقافتی مدوجزر کی مختلف النوع لہروں اور دائروں کو اپنے اندر سمیٹتی ہوئی اُردو شاعری کے لسانی، معنیاتی اور جمالیاتی امکانات کو زیادہ سے زیادہ روشن اور وسیع کر رہی ہے۔ چنانچہ فرید پربتی کے اس مجموعے "ہزار امکاں" کا مطالعہ کرتے ہوئے بھی یہ بات شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ فرید پربتی کی غزلیہ شاعری (بلکہ نظمیہ شاعری بھی) اُردو غزل (شاعری) کی مضبوط و مستحکم روایت پر اپنی اساس رکھتی ہے۔ لیکن اپنے انداز میں اپنی تخلیقی شرطوں کے ساتھ۔ ورنہ فرید پربتی کے اکثر و بیشتر ہم عصر شاعروں کے یہاں، روایت کا احترام تو ملتا ہے لیکن عام طور پر سینئر شعراء کے مضامین اور طرز بیان کی نقل اور تکرار کی صورت میں۔ یہی خاص بات فرید پربتی کی قوت اور ان کے ہم عصر شاعروں کی کمزوری ہے۔ دراصل فرید پربتی کی شاعری میں یہ امتیاز، اساتذہ کے غیر معمولی لسانی شعور اور اظہار و بیان کے مثالی نمونوں (Patterns) کی گہری واقفیت کا نتیجہ تو ہے لیکن اس ضمن میں فرید پربتی کے یہاں عام طور پر Conventional اور Referential معانی سے الگ

الفاظ کا جو تازہ کار اور تہہ دار لسانی برتاؤ ملتا ہے اس کی وجہ سے فرید پربتی کی غزل کلاسیکی غزل کے لسانی اور اظہاری رویوں سے رشتہ تو قائم رکھتی ہے لیکن دوسری جانب عصری زندگی اور ثقافت کے حوالے سے سوچ اور فکر کو تخلیقی تجربہ کے بطور شعر میں پیش کرنے کی ہنرمندی کے سبب جدید ترین لسانی، فنی اور جمالیاتی شعور کا جواز بھی پیش کرتی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا ہے "یہ بالکل ممکن ہے کہ غزل جدید بھی ہو اور کلاسیکی اصولوں کی پابندی بھی کرے" فرید پربتی کی غزل اس کی عمدہ مثال ہے۔ اس کا اندازہ "ہزار امکاں" میں شامل اس طرح کے اشعار سے لگایا جاسکتا ہے۔

جب حدِ ادراک پھاندوں بے کراں کہنا مجھے
خالی از اندیشہ سود و زیاں کہنا مجھے

شکستہ پیکروں میں رنگ بھرنا آگیا ہوگا
ہوا کے ایک جھونکے سے بکھرنا آگیا ہوگا

خریدوں گا میں اب سایہ کہاں پر
کہ بکتی دھوپ ہے ایک اِک دُکان پر

فرصت جو ملے خود سے ملاقات بھی ہوگی
دیوار کے سائے سے نئی بات بھی ہوگی

دورانِ گفتگو نیا پہلو نکل پڑے
میں آپ کہنا چاہوں مگر تو نکل پڑے

نیندوں کا قحط خوابوں کی ارزانی بڑھ گئی
تجھ سے بچھڑ کے اور پریشانی بڑھ گئی

قربت کے سنہرے باب سے ڈر
جل جائیں گی آنکھیں خواب سے ڈر

غزل میں نادر ونایاب مشکل اور غیر روایتی ردیف وقوافی کا استعمال اب ایک عام سی بات ہوگئی ہے لیکن نئے معتبر شاعروں میں عرفان صدیقی، اسعد بدایونی، عبدالاحد ساز اور عالم خورشید کے ساتھ ساتھ فرید پربتی بھی ایسے شاعر ہیں جنہوں نے اس بات میں محض جدت پسندی کا مظاہرہ نہیں کیا ہے بلکہ تازہ مضامین اس طرح باندھے ہیں کہ شعر میں معنوی پہلوداری بھی پیدا ہوگئی ہے اور غزل کی شان میں اضافہ بھی ہوا ہے۔

بیتاب ، بے قرار ، مزاجاً کرخت تھا
شاید مرا رفیق بھی اک تیرہ بخت تھا

کئی دِنوں سے محبتوں کی فضا ہے ناخوشگوار جاناں
نظر نظر میں ہوس ہے قائم نہ نکلا دِل کا غبار جاناں

قلب ونظر کا مسئلہ یوں حل طلب بھی ہے
اے دِل تری تباہی ، کچھ اپنا سبب بھی ہے

تاریک مناظر کو بدلتا ہوں اکیلا
مرقد کا دِیا بن کے میں جلتا ہوں اکیلا

اُردو غزل میں عاشق اور معشوق، زاہد اور شیخ، ناصح اور رقیب زندگی اور

زمانہ کے حوالے سے راست اور واضح کردار سازی کی روایت رہی ہے۔ یہ کردار عام طور پر شاعر کے تخیل وتصور کی پیداوار ہوتے ہیں ترقی پسند غزل سے قطع نظر کلاسیکی غزل سے لے کر جدید غزل تک ایسے اشعار کثرت سے ملتے ہیں جن میں ان کرداروں کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ غزل میں انسان اور انسانیت مخالف فضا پیدا ہوئی اور یہ کردار قاری کے اندر یاسیت، بے یقینی حتیٰ کہ خودکشی تک کے رجحانات پیدا کرنے کا سبب بنتے رہے ہیں۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

نہ پوچھ حال مرا چوب خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

آ کے پتھر تو مرے صحن میں دوچار گرے
جتنے اُس پیڑ کے پھل تھے پس دیوار گرے

لیکن آج عبدالاحد ساز، عالم خورشید، راشد انور راشد وغیرہ کے ساتھ ساتھ فرید پربتی کے یہاں جو کردار سامنے آرہے ہیں وہ محض تخیل وتصور کی پیداوار نہیں بلکہ نئے معاشرہ کے مختلف ومتضاد حالات وحقائق، سوچ وفکر اور اعمال اور رویوں کے زائیدہ حقیقی کردار ہیں جو قاری کے اندر عصری زندگی اور زمانہ کے حوالے سے جینے کا نیا حوصلہ پیدا کرتے ہیں۔

تاریک مناظر کو بدلتا ہوں اکیلا
مرقد کا دیا بن کے میں جلتا ہوں اکیلا
مانا کہ مرے پاؤں لہو رنگ ہوئے ہیں
حالات کے کانٹوں کو مسلتا ہوں اکیلا

''اثبات'' پر ایک نظر

روؤف خیر

''اثبات'' پر نظر ٹکتی ہے۔ پہلی نظر ہی سے یہ شعری مجموعہ متوجہ کرتا ہے صوری اعتبار سے یہ اتنا دلکش ہے کہ صاحب ذوق کی نظر انتخاب اسے پسند ضرور کرے گی۔ باقی ذمہ داری معنوی حسن اپنا گرویدہ کر کے نباہتا ہے۔

ڈاکٹر فرید پربتی کافی پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ شعر علمیت کے بل پر نہیں چونکاتا البتہ شعر سے شاعر کی ہمہ دانی ضرور بولتی ہے۔

صنف رباعی تمام اصناف سخن میں سب سے زیادہ مشکل اور مزاج پوچھنے والی صنف سخن ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بہت کم شاعروں نے اس طرف توجہ کی۔ حالی، انیس، جوش، امجد حیدرآبادی اور یگانہ چنگیزی نے اس صنف میں بڑے اچھے شاہکار چھوڑے ہیں۔ جدید شعراء تو قطعات بھی کم ہی کہتے ہیں رباعیات پر ان کی توجہ ہوتی ہی نہیں یوں بھی رباعی کا فن ریاض چاہتا ہے کئی پابندیوں سے عبارت ہے جبکہ جدید شاعری تساہل پسندی کا شکار ہے۔

ڈاکٹر فرید پربتی اس صنف پر کمال کی دسترس رکھتے ہیں۔ ہر چند کہ وہ بڑے انکسار سے فرماتے ہیں ؎

رومی ہوں نہ رازی ہوں نہ خیام و سعید
ہوں ذرا ناچیز کہ ہے نام فرید
قدرت سے تری اُٹھتا ہے صحرا میں حباب
ذروں سے اگا دیتا ہے لاکھوں خورشید

اس مجموعہ کلام میں غالب تعداد رباعیات ہی کی ہے۔ باقی غزلیں ہیں۔
فرید پربتی کشمیری ہیں اور کشمیر کی جو صورتحال ہے اسے شعری استعارے میں ڈھالنا انہی کا کام ہے۔ فرید کہتے ہیں

شیرازہ دل و جاں کا بکھر جائے گا
دل آگ کے دریا سے گزر جائے گا
حالات کسوٹی پہ پرکھتے ہیں مجھے
ہیہات سبھی رنگ اتر جائے گا

فرید نے بڑے نازک احساسات کو زبان دی ہے اور ناکردہ گناہی کے ماروں کی عکاسی تو دیکھئے

مفہوم طلب غرض نہ غایت ہوگی
جز ایں کہ پذیرائی کلفت ہوگی
انصاف کے والی یہ ذرا بتلا کب
بے جرم اسیروں کی سماعت ہوگی

یہاں سماعت اک خاص عدالتی اصطلاح کی وجہ سے مزہ دے رہی ہے
اس میں شک نہیں رباعیات میں زیادہ تر اخلاقی و مذہبی حکیمانہ اقوال زریں کو منظوم کیا جاتا رہا ہے جوشؔ ملیح آبادی اور فراقؔ نے اس صنف میں بہت کھل کھیلا ہے۔ یگانہ تو غالب کے چچا بن گئے۔ مگر یہ طے ہے کہ بنیادی طور پر رباعیات انفس و آفاق میں جھانکنے ہی سے عبارت آج بھی ہے۔ ڈاکٹر فرید پربتی کے ہاں بھی اس رنگ کی کئی رباعیات چونکاتی ہیں۔

کندن سا کٹھالی میں پگھل جاتا ہوں
چھو جائے صبا رنگ بدل جاتا ہوں
دہکایا ہے آشوب زمانہ نے جسے
ہر وقت اسی آگ میں جل جاتا ہوں

ہوں مملکت مصر سے محروم ابھی
پتھر کے تلے ہے مرا مقسوم ابھی
یوسف کی طرح اندھے کنویں میں ہوں پڑا
ہر خواب کی تعبیر ہے موہوم ابھی

یہ علائم بجائے خود اک داستان ہیں یہ پتھر استصواب عامہ کا ہوسکتا ہے۔

ڈاکٹر فرید پربتی جیسے نوجوان کی زبان اس قدر پختہ ہے کہ ان کی رباعیات ہی میں وہ سانس لے سکتی تھی۔ بعض رباعیات پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نوجوان صوفی فارسی و اردو شعری سرمائے پر گہری نظر رکھتا ہے۔

پیدا یہاں شور ہے پنہاں یہ شغب
جینے کا نہ مقصود نہ مرنے کا سبب
اک بوجھ لئے پھرتا ہے سر پر آدم
دنیا کی تمنا ہو کہ عقبیٰ کی طلب

حالات کی چھلنی میں اسے چھان لیا
ہاں زیست کو ہر رنگ میں پہچان لیا
گر آب بقا بھی ہو نہ میں منہ کو لگاؤں
یہ ٹھان لیا، ٹھان لیا، ٹھان لیا

ٹھان لیا کی تکرار بال ہٹ نہیں بلکہ ''بارغ البال ہٹ'' کی غماز ہے۔

سرمد کے حوالے سے بھی فرید پربتی نے کچھ رباعیات کہی ہے جو سرمد کو خراج کا درجہ رکھتی ہیں اور اس شاہ جنوں کے عرفان کو سلام کرتی ہوئی لگتی ہیں۔ وہی سرمد جس نے کہا تھا ؂

نمی دانم کہ سرمدؔ اندریں دیر
خدائے من ابھے چند است یا غیر

بتانِ ہندی ہوں کہ سندھیا...... جمال پسندوں کو متاثر تو کرتے ہی ہیں...... فریدؔ پربتی سرمد کے سلسلے میں دارا کے ہم خیال ہیں۔ داراشکوہ سرمد کا معترف تھا۔

میں کیا اور میرا علم عروض کیا مگر میرے وجدان کو فریدؔ کی بعض رباعیات کو رباعی ماننے میں تامل ہے ۔

منزل ہے دور شام ہے محو سفر ہوں
ممکن ہی نہیں زیست کا یہ معرکہ سر ہوں
اس رہ میں مسافر کے تعاقب میں ملیں گے
جلتے ہوئے منظر ہوں کہ بے سایہ شجر ہوں

بے آب کبھی ہجر کی شمشیر بھی ہوگی
پیدا کہ ہر اک نالہ میں تاثیر بھی ہوگی
اک دن کہ تفاوت کی یہ دیوار گرے گی
شرمندہ اس اک خواب کی تعبیر بھی ہوگی

اگر ڈاکٹر فریدؔ نے اجتہاد کیا ہے تو الگ بات ہے ورنہ یہ رباعی کے مخصوص اوزان سے الگ ہیں۔

اک رباعی میں ڈاکٹر فرید نے کہا کہ ''بیاؔ'' غیر مشدد ہے مگر شعری ضرورت کی بناء پر اسے مشدد گردانا گیا ہے۔ ان کا مصرع ہے بیا کی طرح گھر بھی بنایا میں نے...... اس مصرع کو آسانی سے یوں کہا جا سکتا تھا مانند بیا گھر بھی بنایا میں نے۔

ڈاکٹر فرید کی غزل انہیں پھر زمین سخن سے جوڑتی ہے۔ رباعی میں تو وہ

آسمانوں کی سیر کررہے تھے

لے کے نئی نئی غزل آہی گئے فریدؔ اب
سن اے چراغ انجمن تیرا زوال اب نہیں

ڈاکٹر فرید کی غزل بھی ان کی اپنی زمین سے جڑی ہوئی ہے

کسی پہ کرنا نہیں اعتبار میری طرح
لٹا کے بیٹھو گے صبر و قرار میری طرح

تمنا ان پہ اپنی آشکارا کر رہا ہوں
جو پہلے کر چکا ہوں اب دوبارہ کررہا ہوں

مجموعے کے آخر میں تین تضمینیں بھی شامل ہیں۔ دو داغؔ کی غزلوں پر اور ایک اقبال کی غزل پر کہی ہوئی ان تضمینوں سے بھی ڈاکٹر فرید پربتی کی فنی دسترس کا پتہ چلتا ہے۔

●□●

تلاش و جستجو کی عمدہ مثال......فریدؔ پربتی

ڈاکٹر مظہر احمد

زیر نظر کتاب 'انتقاد و اصلاح' ڈاکٹر فرید پربتیؔ کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا ایک گراں قدر مجموعہ ہے۔ آج کے سہل پسند دور میں فرید پربتی نے عروض و اصلاح کے بظاہر دقیق اور محنت طلب موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ اس کتاب میں کل چھ مضامین: اصلاحِ سخن، کلاسیکی شاعری اور علم عروض وقافیہ سے متعلق ہیں جبکہ دو مضامین تنقیدی نوعیت کے ہیں۔ فریدؔ پربتی نے تحقیق کی دشوار گزار گھاٹیوں میں کوہ پیمائی کی ہے اور اس سفر کو قدرے آسان بنا دیا ہے۔ ان کے یہ مضامین تلاش و جستجو کی عمدہ مثال ہیں۔

کتاب کا پہلا مضمون شاہ حاتمؔ کے دیوانِ قدیم اور دیوان زادے کے علمی و تحقیقی تجزیئے سے تعلق رکھتا ہے۔ بقول ڈاکٹر فرید پربتی دیوانِ قدیم میں حاتمؔ پر ولیؔ دکنی کے اثرات بڑی حد تک نمایاں نظر آتے ہیں اور زبان و بیان نیز ایہام کے بکثرت استعمال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ حاتمؔ، دیوانِ قدیم کے دور میں آبرو کی طرح دہلی کے منفرد شاعر نہیں تھے۔ اس دور کی چند نظمیں قابل ذکر ہیں۔ جنکی تعریف میرؔ نے بھی کی ہے اور ان نظموں پر ولیؔ کے اثرات بھی کم ہیں۔

ایہام گوئی کے اثرات سے نکلنے کے بعد سب سے پہلے حاتمؔ نے صاف گوئی کی ابتداء کی اور اپنے پورے کلام کو رد کر کے نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ

دیوان زادہ ترتیب دے کر اردو شاعری کے ارتقاء میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر فرید پربتی نے تفصیل کے ساتھ حاتم کی شاعری کی لسانی خوبیوں پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ دیوانِ قدیم اور دیوان زادے کے منتخب اشعار کے ذریعے اصلاح یا صاف گوئی کی طرح واضح اور مدلل اشارے کئے ہیں۔ پچاس صفحات پر مشتمل اس مضمون کے آخر میں حاتم کی شاعری کے نمایاں موضوعات پر بھی رائے زنی کی ہے۔

اصلاحِ شعر پر فرید پربتی کے مضامین میں دورِ متقدمین میں استادی و شاگردی کی شاندار روایت پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اساتذہ نے اپنے شاگردوں کے کلام کو معمولی ردوبدل کے ذریعے زمین سے اٹھا کر کس طرح آسمان پر پہنچا دیتے تھے اور تربیت وتہذیب کے کیسے کیسے فرائض انجام دیتے تھے۔ ان سب کی تفصیلات ان مضامین میں موجود ہے۔ گروہ بندی، معاصرانہ چشمکیں اور ادبی معرکے بھی اس ذیل میں آتے ہیں۔

''اردو شاعری میں اصلاحِ سخن کی روایت'' کے عنوان سے مصنف کا طویل مضمون اردو شاعری میں اصلاح کی روایت کی تاریخ کو بڑی حد تک مرتب کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ اساتذہ اور ان کے تلامذہ کے سلسلوں پر بھی انہوں نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ نیز دہلی اور لکھنوی دونوں ادبی مراکز کے قابلِ ذکر اساتذہ اور ان کے شاگردوں کا احوال قلم بند کرتے ہوئے، شاگردوں کے اشعار پر اساتذہ کی اصلاح پر بھی رائے زنی کی ہے۔ فرید پربتی کا یہ مضمون بھی ان کے دیگر مضامین کی طرح تحقیقی نوعیت کا ہے مگر دلچسپی سے قطعی خالی نہیں۔ شگفتہ تحریر اور رواں دواں اسلوب کی بدولت اس نوعیت کے مضامین خاصے کی چیز ہیں۔

مذکورہ مضامین کے علاوہ اس کتاب میں صنفِ رباعی سے متعلق دو مضامین شامل ہیں۔ ایک مضمون میں کشمیر میں رباعی کے فروغ و ارتقاء پر اظہارِ خیال کیا ہے جبکہ دوسرے مضمون میں ڈاکٹر سلام سندیلوی کی تنقیدی نگارشات کا

محاکمہ پیش کیا گیا ہے اور بحیثیت ناقدِ رباعی ان کی قدر و منزلت کو سراہنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

مضمون ''ایطاء'' فرید پربتی کے علمِ قافیہ پر عبور کا ثبوت فراہم کرتا ہے جبکہ ''ہارے ہوئے سپاہی کی رجز'' کے عنوان سے اسعد بدایونی کی غزل پر ان کا تنقیدی مضمون اپنے ہمعصر شاعر کی ادبی نگارشات کو منظر عام پر لانے کی مخلصانہ کوشش سے عبارت ہے۔

غرض متوازی اندازِ نظر، غیر جانبدارانہ رویے، مدلل اور واضح اسلوب اور بے داغ اندازِ تحریر نے ان مضامین کو جلا بخشی ہے۔

خوبصورت سرورق اور عمدہ طباعت نے کتاب کے ظاہری حسن میں بھی چار چاند لگا دیئے ہیں۔

●□●

'آبِ نیساں' کے حوالے سے

سیّد رسول پونپُر

یہ امر مسلمہ ہے کہ دُنیائے فن و ادب میں کوئی چیز بالکل نئی نہیں اور یہ تو اندازِ بیان ہی ہے جو کسی شعری یا ادبی تخلیق کو نیا پن عطا کرتا ہے۔ اس لئے بلا تردّد کہا جاسکتا ہے کہ فرید پربتی بھی اپنی عصری فنی روایات وادبی رجحانات سے جڑے ہوئے ہیں۔ موجودہ پُرآشوب دور کی کرب آگہی کو انہوں نے مختلف صورتوں میں زبان دی ہے۔ تخلیقی عمل گو کہ ایک انفرادی معاملہ ہے لیکن گوناگوں خارجی عوامل جو کہ کسی بھی سماجی ماحول کا جزو لاینفک ہیں، کے بالواسطہ یا بلاواسطہ اثرات سے دامن نہیں بچایا جاسکتا ہے۔ اس بات کا ثبوت ان کے مندرجہ ذیل یہ اشعار ہیں۔

ہاری ہوئی سرحد پہ ڈٹا اس لئے ہوں میں
جیتے ہوئے دُشمن کی کبھی مات بھی ہوگی

اس درجہ بڑھے نقلِ مکانی کے یہاں شغل
تعمیر کہیں پر بھی مکاں کر نہیں پاتے

کرائے دار سے ہوشیار رہنا
کہیں قابض نہ ہو جائے مکاں پر

یہ نہیں پہچان سکتا ہوں میں اب
تھا کہاں پر شہر میں میرا مکان

کہیں پہ سبزہ نہ کوئی نشان پانی کا
نہ جانے لے کے کہاں مجھ کو آ گئی ہے ہوا

زندگی کا بنیادی اصول مسلسل تبدیلی ہے، جس کے دامن میں ہجر و وصال اور تعمیر و تخریب کے روپ میں درد کی چنگاریاں چھپی رہتی ہیں، جو رہ نوردِ عشق کا سرمایہ افتخار ہیں۔ ۱۹۶۰ء سے آج تک جو شعری تجربے اُردو ادب میں ہوئے، اُن کے پیش نظر فرید پربتی کی تخلیقی زبان نامانوس نہیں لگتی۔ خصوصاً جب ہم برصغیر ہندو پاک کی تخلیقی کاوشوں کے قطع نظر بھی اپنی ریاست کے ممتاز شعراء حامدی کشمیری، حکیم منظور، عابد مناوری، ایرج کشمیری، محمد یٰسین اور پرتپال سنگھ بیتاب و دیگر جدید شعراء کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس لئے ہمیں چاہئے کہ ہم فرید پربتی یا کسی اور شاعر کی تخلیقات ریاست اور ریاست سے باہر مجموعی شعری تناظر میں پرکھیں۔ توصیف و تنقید کرتے وقت حتمی فیصلے صادر کرنے سے گریز کرنا بھی لازم ہے۔ بالخصوص جب کسی شاعر کا تخلیقی سفر ابھی شروع ہی ہوا ہو۔

فرید پربتی نے اگر اپنی تخلیقات کے ساتھ ساتھ اُن کی تحریر کرنے کی تاریخیں بھی دی ہوتیں تو اُن کے تخلیقی سفر کو صحیح تناظر میں پرکھنے میں آسانی ہوتی۔ امید ہے کہ وہ آگے اس جانب توجہ دیں گے۔

متفرقات و رباعیات میں فرید پربتی کا انداز کلاسیکی، منتخب، جداگانہ، تیکھا، فنکارانہ اور ماہرانہ ہے۔ لگتا ہے کہ انہوں نے بہت کم مدت میں بہت کچھ پالیا ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ چلتا ہوں
پاؤں کی بیڑیاں بدلتا ہوں

تیرے آنگن میں پھول کھِل آئے
میرے جیسا تو بدنصیب نہیں

اِک پیڑ کہ جس پر کوئی پتّا ہے نہ پھول
رہتا ہوں اُس پیڑ کی چھایا میں ملؤل
حیرت کے سوا زیست کا حاصل کیا
اس قحبہ سے دل کو لگانا ہے فضول

اُمید کی جاسکتی ہے کہ اُردو کے ادبی حلقوں میں ''آبِ نیساں'' کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ فرید پربتی کا ذوقِ جمال، ہمہ گیر حوصلہ شکن ماحول میں قابلِ صد ستائش ہے کہ وہ اپنی تخلیقات کو نہایت ہی دیدہ زیب اور عمدہ زیورِ طباعت سے آراستہ کرتے ہیں۔

●□●

"گفتگو چاند سے" پر ایک نظر

دیپک بدکی

بولتی روحِ غنیؔ ہے تیرے شعروں میں فریدؔ
یہ ہمیں اندازہ تیری خوش بیانی سے ہوا

اتنا تو ظاہر ہے کہ فرید پربتی کے کلام سے وادیٔ کشمیر کی بوباس شدت سے آتی ہے چاہے وہ ان کی غزلیں ہوں یا رباعیاں۔ البتہ ان کی طبیعت اور شاعری دونوں میں کہیں بھی انتہا پسندی کا، جس کا وہ دعویٰ کرتے ہیں، احساس نہیں ہوتا۔ ہاری پربت سے، جس پر ایک جانب شارکا دیوی کا مندر ہے اور دوسری جانب مخدوم صاحب کی زیارت، وابستہ ہونے کے باعث فریدؔ نے اپنے نام کے ساتھ پربتی جوڑا ہے۔ ابتداء میں کامرس میں ایم کام کی ڈگری لی لیکن بعد میں دل اُکتا گیا تو اُردو کی طرف رخ کر کے ایم اے، ایم فل اور ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کر لیں۔ آج کل کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں لیکچرر ہیں۔ گذشتہ پچیس تیس برسوں سے اُردو شاعری اور نثر دونوں کی آبیاری کر رہے ہیں۔ شاعری میں ان کی خاص دلچسپیاں غزل اور رباعی ہیں جبکہ نثر میں انہوں نے قدیم وجدید ادب کو کھنگال کر انتقادیات میں نام پیدا کیا ہے۔ زیرِ نظر مجموعے سے پہلے ابرِ تر (۱۹۸۷ء)، آبِ نیساں (۱۹۹۲ء)، شہ زور کاشمیری (۱۹۹۲ء)، اثبات (۱۹۹۸ء)، فرید نامہ (۲۰۰۳ء) اور انتقاد واصلاح (۲۰۰۵ء) منظر عام پر آ چکے ہیں۔

فریدؔ پربتی روایتی شاعری کے پرستار ہیں۔ پھر بھی نہ تو وہ دوسروں کے خیالات کو نئے سانچوں میں ڈھالنے میں یقین رکھتے ہیں اور نہ ہی اپنے آپ کو دہراتے ہیں ان کی یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ نت نئے خیالات، تشبیہات اور استعارے استعمال کریں اور روایتی شاعری میں نئی روح پھونک دیں۔ وہ قافیہ اور ردیف کے پابند بھی ہیں اور صاف ستھری زبان کے رسیا بھی۔ داغ دہلوی سے خاصے متاثر بھی نظر آتے ہیں۔ خواب وخیال کی دنیا میں وہ ایسے کھو گئے ہیں کہ اکثر اپنے وجود سے بھی بے خبر رہتے ہیں۔

تمام عمر خریدے ہیں اور بیچے خواب
علاوہ اس کے کوئی کاروبار کر نہ سکا

تصور کی دنیا میں کھو کر انسان ہمیشہ دنیا کے مکروفریب سے بے خبر رہتا ہے اور اکثر وبیشتر زندگی میں دھوکا کھا جاتا ہے۔

مٹی کی سب امانتیں مٹی کو سونپ دیں
اک گھر بچا تھا وہ بھی مرا بھائی لے گیا

میں نے ہی بخشی تھی اُس کو قوتِ پرواز کل
آج جو خوش ہو رہا ہے مجھ کو بے پر دیکھ کر

گذشتہ تیس سالوں میں اُردو ادب پر جدیدیت کا خاصہ اثر رہا ہے جس کے باعث شاعری میں خود اپنی تلاش، تنہائی، یاسیت، قنوطیت، بے بسی اور بے ثباتی کا بار بار ذکر ہوتا ہے۔ ایسے پس منظر میں فرید پربتی کا ان چیزوں سے بچ کر نکلنا ناممکن ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ے میں اک چراغ ہوں تہہِ داماں نہ رکھ مجھے — تنہا ہوں چار سمت ہے یلغار تیرگی
ے ہوگا مرے پیچھے کربلا آگے — میں اب کے پیاس کی کھینچوں گا اس طرح تصویر — فُرات
ے ساحلِ اُمید پر گھر بنتے بنتے رہ گیا — اک تھکا ہارا مسافر سوچتا ہے دیر سے

۔ روز دکھلاتا ہوں میں زخم نہاں ایک نیا مشغلہ ہاتھ لگا عمر رواں ایک نیا
۔روز آتا ہوں پلٹ کر میں لئے ٹوٹے خواب روز کرتا ہوں مگر کارِ زیاں ایک نیا
۔ اتر کے پار جلائینگے کشتیاں اپنی پھر اسکے بعد منانا ہے اپنا ماتم بھی
۔ خوابوں کا اِک ہجوم شکیبائی لے گیا چھوڑا مجھے مگر مری تنہائی لے گیا
۔ لگتا تھا کل خوش بخت ہوں بے انتہا پر آج میں مایوس ہوں ، حیران ہوں
۔ تیرہ شبی نے آلیا میرا وجود بے شمع کا مانوس ہوں ، حیران ہوں

پربتی کی غزلوں میں عشق کا موضوع غالب نظر آتا ہے۔انہوں نے عشق کے میدان میں اپنے تجربات، مشاہدات اور تصورات قلمبند کئے ہیں۔وہ سیرت کو صورت پر ترجیح دیتے ہیں۔ معشوق کو ستمگری کا رونا روتے ہیں اور وصال وہجر میں لمحہ لازوال کے متلاشی ہیں۔

۔ ربط پیدا اِس قدر اُس یار جانی سے ہوا وہ خفا مجھ سے میں اپنی زندگانی سے ہوا
۔روز دکھلاتا ہوں میں زخمِ نہاں ایک نیا مشغلہ ہاتھ لگا عمر رواں ایک نیا
۔کون آتا ہے مری راتوں کو کرنے معتبر کون جاتا ہے مری شمعیں دھواں کرتا ہوا
۔تری طلب نے مجھے زندگی کے بارے میں کئی سوال کئے اور میں لاجواب رہا
۔پہلے وہ ڈالتا ہے آگ کے دریاؤں میں پھر اُسی آگ کو گلزار بھی کر دیتا ہے

(عشق حقیقی کے تناظر میں خوبصورت شعر۔
حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کے پس منظر میں)

یہ بات الگ ہے کہ شاعر کو عصری زندگی کی ریس اور چوہا دوڑ سے کوفت ہوتی ہے اور وہ زندگی کا مفہوم کہیں اور ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۔ جانے کیوں ناپتا رہتا ہے وہ سایہ اپنا کیسے کہہ دوں اُسے سایوں کا کوئی قد بھی نہیں
۔پہلے پوچھا جو نہیں تھا وہی سب پوچھتی ہے زندگی رات سے جینے کا سبب پوچھتی ہے

فرید پربتی نہ صرف غم جاناں میں نالہ وفغاں کرتے ہیں بلکہ غم دوراں کو بھی سینے سے لگائے پھرتے ہیں۔انکے یہاں عصری آگہی بھی ملتی ہے اور حالات

حاضرہ کا معروضی تجزیہ بھی۔ پچھلے پندرہ برسوں سے کشمیر جن حالات سے گزر رہا ہے شاعر نے ان حالات کی بے ساختہ منظر کشی اپنی دو نظموں نروان اور شہر آشوب میں کی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں بھی انہوں نے اس کرب و بلا کا اظہار یوں کیا ہے:

کھو گئے گاڑھے دھویں میں شہر کے منظر تمام — اک پرندہ رہ گیا آہ و فغاں کرتا ہوا
رونق یہ مرے شہر کی اب لے گیا ہے کون — ایک اک سڑک خموش ہے ایک اک دکان بند
اس درجہ گھٹ گیا ہے مکینوں میں اعتماد — کرتے ہیں شام ہونے سے پہلے مکاں بند
اپنے سے جدا ہو کے بھی زندہ ہیں یہاں لوگ — اس شہر فسوں کے ہیں کمال اور طرح کے
اُن منظروں کو دیکھنے کی تاب ہی نہ تھی — ایسا نہیں کہ میں نے نظارا نہیں کیا

کشمیر کے مسئلے پر ہندو پاک مذاکرات پر طنز کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں

ملنے کو تو ملتے ہیں مگر دل نہیں ملتا — رشتے ہوئے ہیں اب کے بحال اور طرح کے

ایسے اجڑے اور ویراں شہر سے گذرتے ہوئے یادوں کے قافلے کبھی ناسٹلجیا بن کر شاعر کو پریشاں بھی کر دیتے ہیں۔

اسی رستے پہ کبھی میں نے جلائے تھے چراغ — اسی رستے پہ کبھی میں تھا کھڑا یاد آیا

اسکے باوجود وہ امید کا دامن نہیں چھوڑتے اور زندگی کو رواں دواں دیکھنے کے کوشاں ہیں۔

یہ بھاگ دوڑ علامت ہے زندگانی کی — ٹھہرتے لمحوں کی خاموشیوں سے بچ کے چل
کوئی بتا کے گیا تھا پلٹ کے آؤں گا — اس اِک امید میں شمعیں جلائے دیتا ہوں

فرید پربتی کے بارے میں پروفیسر قدوس جاوید لکھتے ہیں: ”فرید پربتی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور غزل جیسا کہ معلوم ہے روایات اور اجتہادات کے تمام تر مرحلوں سے گزر کر اپنی آج کی جدید صورت میں معاشرتی اور ثقافتی مدوجزر کی مختلف النوع لہروں اور دائروں کے ساتھ سامنے آنے والی وہ صنف سخن ہے جو شعر بہ شعر پوری اُردو شاعری کے لسانی معنیاتی اور جمالیاتی نظام کے

امکانات کو زیادہ سے زیادہ روشن اور وسیع کر رہی ہے۔

پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی کا ماننا ہے کہ فریدؔ پربتی نے کشمیر میں رہتے ہوئے وہاں کے سیاسی وسماجی منظرنامے کا ایک حصہ ہوتے ہوئے بھی خود کو صرف کشمیر کی حد تک محدود رکھنا پسند نہیں کیا۔ اسکے برعکس وہ اپنی شناخت پورے ملک بلکہ وسیع تر کائنات اور اسکے لامحدود افکار علائق سے قائم کرتے نظر آتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے یہاں ایک آفاقی شعری تناظر کی بھی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔

●□●

فریدؔ بحیثیت رباعی گو

ڈاکٹر خالد اشرف

اردو شاعری سے وابستہ تخلیق کار، تنقید نگار، قاری سبھی معترف ہیں کہ ایک غزل زدہ معاشرے میں اظہار کے نئے سانچے تلاش کرنے اور پرانے روایتی سانچوں واستعاروں سے مجادلے کی کوشش کرنے کے مترادف ہے غزل پر ایک ایسا سخت دور بھی آیا کہ اس کی گردن مارنے کی تجویزیں بھی پیش کی گئیں اور اس کو ایک زوال آمادہ صنف سخن بھی قرار دیا گیا، لیکن غزل کی سخت جانی پر کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔

تاہم غزل کے طلسم سے نکلنے کی مستحسن کوششیں جاری رکھی گئیں اور یہ کوششیں بارآور بھی ہوئیں۔ ورنہ ''جدید نظم''، ''ہائیکو''، ''سانیٹ''، ''دوہے'' اور ماہیے'' جیسی نئی اصناف اردو میں متعارف ہی نہ ہو پاتیں۔ اسی قبیل کی ایک کوشش ڈاکٹر فرید پربتی نے کی ہے۔ ان کا خوبصورت مجموعہ رباعیات ''فرید نامہ'' ایک کلاسیکی صنف سخن کو وقار عطا کرنے کی کوشش ہے اور بلاشبہ یہ کامیاب کوشش ہے۔

فارسی اور اردو کلاسیکی شعریات میں 'رباعی'' ایک مختصر صنف کے طور پر ہمیشہ جانی پہچانی جاتی رہی ہے اور اس کی ابتدائی ایرانی الاصلہے۔ پروفیسر شیرانی کے مطابق رباعی کسی شخصی ایجاد کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ قدیم ''چہار بیتی'' کی ترقی یافتہ شکل ہے جو ہزج مربع اخرم واخرب میں لکھی جاتی تھی۔ ان ایام میں صدر

وابتداء میں اخرب ومکفرف اخرب ومحزوف کااختلاف جائز سمجھا جاتا تھا جو چار بیتی کے ہر مصرعے میں کارفرما ہے۔ رباعی کے فارسی محققین کی فہرست میں پروفیسر پرویز ناتل خانلری کا نام سرفہرست آتا ہے۔ رباعی کے اوزانِ بحر ہزج سے اختراع کیئے گئے ہیں۔

ڈاکٹر فرید پربتی اپنے مجموعے کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں کہ "رباعی "سنطور" پر گائی جانے والی صنف ہے اور سنطور ثقیل آوازوں پر مشتمل نہیں ہوسکتا۔ رباعی کے اوزان میں جو لحنیں پیدا ہوتی ہیں۔ موسیقی کی اصطلاح میں ان کو "ترانہ" کہا جاتا ہے۔ چونکہ اس وزن سے پیدا ہونے والی لحنیں فن موسیقی میں بڑی پسندیدہ اور ایرانی مذاق موسیقی کے عین مطابق تھیں۔ اس لئے ان اوزان کا نام ہی "ترانہ" رکھ دیا گیا"۔

فرید پربتی جدید اردو شاعری میں کوئی محتاجِ تعارف نام نہیں ہیں۔ ان کا اولین شعری مجموعہ "ابرتر" سال ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا تھا جس نے کلاسیکی قسم کے پروردگانِ ذوق کو چونکایا تھا اس کے بعد "آبِ نیساں" اور "اثبات" سامنے آئے تب تک فرید پربتی ایک معتبر اور صاحب طرز شاعر کے طور پر مقبول ہو چکے تھے۔

"فرید نامہ" کی رباعیاں اردو رباعی گویوں ...... علامہ اقبال، جگت موہن لعل رواں، یگانہ، امجد حیدر آبادی اور فراق گورکھپوری وغیرہ کے سلسلے کی ایک کڑی ہوتے ہوئے بھی اپنے تازہ کار لہجے اور اظہارِ ذات کی عکاسی کے لحاظ سے کافی منفرد ہیں۔ حالانکہ فرید پربتی کی تربیت متصوفانہ ماحول میں ہوئی لیکن انہوں نے خود پر یا اپنی شاعری پر کبھی صوفیت طاری نہیں ہونے دی۔ وہ زبان وعروض کے بنیادی نکات سے واقف ہیں اور حتیٰ الوسع ان نکات کا احترام بھی کرتے ہیں تاہم ان نکات کو انہوں نے اپنے پاؤں کی زنجیر نہیں بننے دیا ہے۔

پھولوں سے چُرا کر وہ مہک بھیجتا ہے
آکاش کی خوش رنگ دھنک بھیجتا ہے
خالی نہیں رہ سکتا ہوں وہ جانتا ہے
زخموں کے لئے تازہ نمک بھیجتا ہے

بے کیف شب و روز کو اچھا کر دے
ارمان مرا اب کے یہ پورا کردے
ہیں موت کے سامان یہاں چاروں طرف
اب زیست کے سامان مہیا کر دے

فریدؔ پربتی کی رباعیات کا سرا جہاں ایک طرف شاعری کے لب ولہجہ سے ملتا ہے وہیں دوسری طرف ان کی شاعری عصر جدید انسانی پیچیدگیوں سے بھول بھلیوں میں زیست کرنے والے حساس اور ذی شعور فرد کی انا کا اظہار بھی ہے

طوفانِ حوادث میں بکھرتا ہے وجود
اک آگ کے دریا سے گزرتا ہے وجود
ہے غولِ بیاباں کا تعاقب شب و روز
اس تیرہ خاک داں میں ڈرتا ہے وجود

حالانکہ اپنے اختصار کے اعتبار سے رباعی میں اظہار اور ادا کی حدود ہوتی ہیں لیکن فریدؔ پربتی ایک کہنہ مشق شاعر کے طور پر معجز بیانی کے رموز سے آشنا ہیں وہ زندگی کے ہر طرح کے دقیق مسائل سے فنی طور پر نبرد آزما ہونے اور ترسیل واظہار کے مسائل کی حدود کو توڑنے، بلکہ ان کو وسعت عطا کرنے کے اہل ہیں۔ ان کا کمٹمنٹ دراصل کسی خاص نظریۂ زیست یا نظریۂ فن سے نہیں ہے۔ بلکہ اُن کا بنیادی سروکاری شعریت اور شعری اظہار سے ہے اظہار کے دوران فریدؔ پربتی کا لہجہ کہیں بھی بے لحن یا خالی از شعریت نہیں ہوتا ہے کیونکہ شاعری کے ضمن میں وہ

"تجربہ برائے تجربہ" کے قائل نہیں ہے کلاسیکی غزلیہ شاعری کی موسیقیت اور الفاظ وتراکیب کی تراش وخراش سے فرید پربتی حسب ضرورت مستفید ہوتے ہیں لیکن اپنے مخصوص ومنفرد جدید لہجے اور نئے شعری پیکروں کی تشکیل کے عمل پر گرفت بھی قائم رکھتے ہیں۔

لو ڈوبا ہے مغرب میں شرارا کوئی
روشن ہوا پھر چاند ، نظارہ کوئی
ہر شام طلب کرتا ہے وہ مجھ سے مجھے
ہے نفع کہ اس میں ، ہے خسارہ کوئی

ہاں جبر کے ہاتھوں میں مجبور ہوں میں
پھر قہر کی ظلمت کا مقہور ہوں میں
جھٹلانے لگا وقت کا فرعون مجھے
موسیٰ ہوں تجلّی ہوں میں، طور ہوں میں

عشق نہ صرف جذباتِ انسانی میں ایک اہم ترین مقام رکھتا ہے فارسی اور اردو شاعری میں بھی عشق اور عشق کے لوازمات ومختلف زمانوں میں نئے نئے اسالیب اور انداز ہائے فکر سے برتا گیا ہے۔ فرید پربتی بھی عشق کے وجود اور اُس کی لطافت احساس کے منکر نہیں ہیں۔ اُن کی رباعیوں میں اس اُم الموضوعات کو سرخروئی سے برتا گیا ہے۔

اخلاص کا اک مرکز و محور ہے قریب
بے سمت وجہت رہ کا شناور ہے قریب
میں نے جو کہا عشق کا معنی کیا ہے
اُس نے یہ کہا ، دیکھ سمندر ہے قریب

اکثر میں یہاں آگ کی خاطر آیا
ہاں دائرۂ عقل سے باہر آیا
لوہے کے چنے چبانا ہے عشق فرید
جو کر نہ سکا تھا ، میں وہی کر آیا

'فرید نامہ' میں شہیدِ عشق، صوفیٔ اعظم وامام الرباعیِ گویاں، شیخ سرمد کو خراجِ عقیدت کے طور پر تین رباعیاں بھی شامل ہیں۔ جو فرید پربتی کی روایت شکن طبیعت کا سراغ دیتی ہے۔

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ "فرید نامہ" میں رباعی کے کلاسیکی رباعی کے سرمایہ کو نہ صرف مزید دولت مندی عطا کرنے کی شعوری کوشش کی گئی ہے بلکہ ایک منفرد اور منضبط شعری لہجے کو بھی قائم کیا گیا ہے۔ فرید پربتی کا یہ مجموعہ نہ صرف معنوی و موضوعاتی زاویہ جات ہے خوش فکری و خوش جمالی کا امتزاجی نمونہ ہے۔ بلکہ خوشنمائی کے لحاظ سے بھی نہایت دیدہ زیب ہے۔ طباعت و کتابت کے حسن نے ان کی رباعیوں کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔

●□●

اثبات......فلسفۂ حیات کی تلاش

سعید اختر اعظمیؔ

رباعی اُردو کی مشہور صنف سخن ہے۔ مگر اسے غزل جیسی مقبولیت حاصل نہیں ہوسکی۔ رباعی نے اردو شاعری کے آغاز کے ساتھ ہی اپنی جگہ بنالی تھی۔ اردو کے قدیم شعراء قلیؔ قطب شاہ، ولیؔ، فائز دہلویؔ سے لیکر عہد حاضر کے شعراء تک سبھی نے اس صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل، قصیدہ، مرثیہ کی طرح رباعی بھی فارسی سے اُردو میں منتقل ہوئی۔ فارسی میں صدیوں سے اس صنف نے فنی اور فکری سطح پر کافی ترقی کی اور خیام جیسا رباعی گو پیدا ہوا۔ اردو میں یہ صنف اپنی تمام تر روایتوں سمیت آئی۔ یہ صنف بنیادی طور پر ایک فکر انگیز صنف ہے۔ فلسفہ، اخلاق تصوف کے ساتھ عشقیہ اور جمالیاتی مضامین کا اس میں اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ بیسویں صدی میں جن شاعروں نے اس صنف کی طرف سنجیدگی سے توجہ دی ان میں امجد حیدرآبادی، جگت موہن لعل رواںؔ، اثر لکھنوی، جوشؔ اور فراقؔ گورکھپوری۔۔ کے نام قابل ذکر ہیں۔ رباعی کے موضوعات اور فن کے سلسلے میں جوشؔ نے لکھا ہے:

''اس صنف کی تخلیق دراصل پختہ زندگی کے وسیع تجربات کو ہموار کر کے اور رسیدہ فکر کے عجیب و عمیق افکار کو ترتیب دیکر قلیل مگر جگردار الفاظ کی معرفت حکیمانہ لہجے میں ادائیگی کے لئے کی گئی ہے تا کہ اس

کے اجمال کے آستانہ جمال پر تفصیل کا اجلال سر بسجود ہو کر رہ جائے"۔

یوں رباعی اردو شاعری میں استاذانہ فن تسلیم کیا جاتا ہے۔ پھر اس پس منظر میں نوخیز اور نو آموز کشمیری کا اس میدان میں قدم رکھنا ایک جرأت مندانہ عمل ہی کہا جائے گا۔ چار مصرعوں میں بات کا حق ادا کر دینا وہ بھی اس طرح سے رباعی کا منظر نامہ کہیں بھی دھندلا نہ پڑے نیز اوزان و بحور، زبان و بیان کے تمام رموز و نکات کا ملحوظ رکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اس مجموعے کے مطالعے سے ایسا لگتا ہے کہ فرید پربتی کا مزاج غزل کے مقابلے میں رباعی کیلئے زیادہ موزوں ہے۔ ان کی رباعیوں میں برجستہ پن، اور بے تکلفی کا احساس ملتا ہے فرید پربتی کی رباعیوں کے تعلق سے شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

"فرید پربتی نے اِن دنوں کثرت سے رباعیاں کہی ہیں۔ میرا خیال ہے وہ رباعی کے فن کی رعایتیں ملحوظ رکھنے کی صلاحیتیں رکھتے ہیں جو رباعیاں میں نے دیکھیں ان میں کہیں کہیں نئے رنگ و آہنگ اور نئے احساس کی چمک نظر آئی"۔

یوسف ٹینگ کے الفاظ میں:

"فرید پربتی نے رباعی کے سانچے کو تو قابو میں کر لیا ہے لیکن اس کے الفاظ و اظہار میں جو صلاحیت اور صیقل ہونی چاہئے اس کیلئے انہیں بہت محنت کرنا پڑے گی۔ رباعی کے چوتھے مصرعے میں جو ڈنکے کی بڑی چوٹ ہوتی ہے اس کی تلاش بھی ضروری ہے"۔

ان آراء سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ فرید کی رباعی میں نئے رنگ و آہنگ اور احساس کی رمق ضرور ہے لیکن اسے برتنے کا بہتر ڈھنگ اور ڈنکے کی چوٹ ابھی بھی مفقود ہے یہ بات کافی حد تک درست ہے کہ ان کی رباعیوں میں وہ سلاست اور روانی موجود نہیں ہے جو رباعی کا خاصہ ہے۔ ان رباعیوں کے تعلق سے سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان میں جا بجا وادی کشمیر کا عکس

جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ نیز فلسفہ حیات کی تلاش بھی ان کے اندر موجود دکھائی دیتی ہے۔ فریدؔ پربتی کی شاعری کے حوالے سے قاضی عبد الرحمٰن ہاشمی نے اپنے خیالات کا اظہار اِن الفاظ میں کیا ہے:

''فرید پربتی کی شعری جمالیات کا نکتہ، حوالہ اور محور بالعموم وادی کشمیر کی زندگی ہے اسکے دریا، چمن زار، سرسبز ماحول اور احساسی کیفیت کا حامل گرد و پیش کا منظر نامہ ہے جو شاعر کے وجود کے رگ و ریشے میں بھی گرم خون کی مانند گردش کرتا ہے''

پروفیسر موصوف کے اس نکتے کی ترجمانی وہ رباعیات جو شہر آشوب کے عنوان سے ہیں ان میں بخوبی نظر آتی ہے۔ صحن چمن کی ویرانیاں، رہزن بنام رہبر، شیرازہ محبت کی پریشانی، انسانی وحشیانہ پن اور بے زاری، تھکن، موجودہ سیاسی ہلچل نیز کشمیر کی تازہ صورتحال کی منظر کشی ان کی رباعیوں میں بخوبی نظر آتی ہے۔ پروفیسر موصوف نے ایک جگہ فریدؔ کی شاعری کے حوالے سے لکھا ہے:

''فرید کو نہ صرف شعری روایات سے واقفیت ہے بلکہ انہوں نے کلاسیکی شاعری اور اسکی بوطیقا سے حسب توفیق استفادہ بھی کیا ہے۔ ان کے یہاں نہ سراسر روایت پرستی ہے نہ روایت گزیدگی''۔

چھ صفحات پر پھیلے ہوئے طویل دیباچے میں پروفیسر موصوف نے فریدؔ پربتی کی غزلوں کے حوالے سے مدلل گفتگو کی ہے اور کئی خوبصورت اشعار نیز ان کے تجزیئے بھی پیش کئے ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود ایک کمی جو شدت سے کھٹکتی ہے وہ یہ کہ پروفیسر موصوف کے سامنے فرید پربتی کے گزشتہ شعری مجموعے ابر تر اور آبِ نیساں رہے ہیں، رباعیوں کے اس مجموعے اثبات کا مسودہ نہیں۔ گذشتہ شعری مجموعے کے حوالے سے یقیناً فریدؔ کی شاعری خوبصورت جذبوں کی ترجمان ہے لیکن ابر تر اور آبِ نیساں جیسا رنگ اس مجموعے میں کہیں نظر نہیں آتا۔ بہتر ہوتا کہ آراء دینے والوں کے سامنے اثبات کا مسودہ موجود رہتا اور وہ اس

کے حوالے سے بھی فرید کی شاعری پر گفتگو کرتے۔

رباعیات کے حوالے سے مختلف شاعروں نے حمدیہ اور نعتیہ رنگ اپنی شاعری میں بکھیرے ہیں۔ یہ چیز شعری مجموعوں میں خال خال ہی نظر آتی ہے۔ اس مجموعے میں شامل فرید کی حمدیہ اور نعتیہ رباعیاں ماضی کی روایت کی تجدید ہی نہیں بلکہ قارئین کیلئے روش عام سے ہٹ کر خوبصورت آہنگ بھی عطا کرتی ہے۔

ایک حمدیہ رباعی ملاحظہ ہوں ؂

یکتا بھی یگانہ بھی مشہود و مآل   یکتائی میں تحلیل ہوا عزّ وجلال
حیران تفکر ہے تحمل نگراں   دریا میں ہوا غرق مرا جام سفال

حمد ونعت کے علاوہ دعا، شہر آشوب، سرمد کے مزار پر جیسے موضوعات پر بھی خوبصورت رباعیاں ملتی ہیں نیز متفرقات کے تحت تغیرات زمانہ عصری مسائل اور دیگر موضوعات ان کی رباعیوں میں نظر آتے ہیں۔ دو رباعیاں اس ضمن میں ملاحظہ ہوں ؂

ہر لحظہ نئے سانچے میں ڈھلتی ہے یاد   ناگن کی طرح دودھ میں پلتی ہے یاد
خوشبو کی طرح پھیلتی ہے نس نس میں   صندل کے تلے پھولتی پھلتی ہے یاد

پھر پیرہنِ جاں کی مہک آنے لگی   کافر ہوں ایماں کی مہک آنے لگی
ہیں روح فزا بادِ صبا کے جھونکے   کس سمت سے انساں کی لہک آنے لگی

اثبات رباعیات کا مجموعہ ہے۔ جس میں موضوعاتی رباعیات کے علاوہ متفرق رباعیات کے تحت ۱۰۸ر رباعیات درج ہیں۔ اِن میں زندگی کے مختلف رنگ نظر آتے ہیں لیکن اس مجموعے کے آخر میں مختصر حصہ غزلیات کا بھی ہے۔ جس میں پندرہ غزلیں شامل ہیں۔ غزلوں میں نہ صرف یہ کہ مختلف موضوعات کا تنوع ہے بلکہ تہہ داری بھی موجود ہے۔ بعض غزلوں کا نیا آہنگ بے ساختہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

صفحہ ۹۵ رکی غزل ''اللہ بس باقی ہوس'' جیسی کہاوت کو زندہ جاوید کردیتی ہے۔ دو اشعار ملاحظہ ہوں ؎

عہدِ وفا قول و قسم اللہ بس باقی ہوس
تیرے ستم تیرے کرم اللہ بس باقی ہوس

پیاسی زمیں، پیاسے مکیں ترسیں گے کب تک بے یقیں
چھم چھم برس ابرِ کرم اللہ بس باقی ہوس

عصری مسائل کے ساتھ روحانی وفود بھی فریدؔ کی شاعری میں نمایاں ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

رگ و پے میں سرایت کر گیا وہ
مجھی کو مجھ سے رخصت کر گیا وہ

دل تو بھولا تھا اسے وقت کے دھارے پہ مگر
یاد آتا ہے مجھے پہلے سے بڑھ کر کوئی

قربت کے سنہرے باب سے ڈر
جل جائیں گی آنکھیں خواب سے ڈر

دورانِ گفتگو نیا پہلو نکل پڑے
میں آپ کہنا چاہوں مگر تو نکل پڑے

اس مجموعے کے آخر میں درج تضمینات بھی خوب تر ہیں۔ فریدؔ نے ان کا حق بخوبی نبھایا ہے۔ اس مجموعے کا سرورق بے حد خوبصورت ہے۔ چشم گریاں سے ٹپکتا قطرہ اشک برگ گل کے وجود کی شادابی کا باعث ہے۔ آرٹسٹ نے اسے جس انداز سے پیش کیا ہے وہ واقعی قابل داد ہے، عمدہ کتابت وطباعت سے آراستہ یہ مجموعہ ادبی حلقوں میں ضرور ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

●□●

فرید نامہ ایک نظر میں

ڈاکٹر منظر اعجاز

ڈاکٹر فرید پربتی کہنہ مشق شاعر، صاحب طرز شاراور اردو کی تعلیم وتدریس سے متعلق باوقار اور طرحدار نوجوان ہیں۔ پرکشش اور دیدہ زیب شخصیت کے مالک ہیں "فرید نامہ" ان کا ایک اہم شعری کارنامہ ہے جو تمام تر رباعیات پر مشتمل ہے۔ رباعیات کے متعدد مجموعے اور رسالے میں نے دیکھے ہیں، رباعیات انیس، شاد کی رباعیاں، یاسؔ یگانہ چنگیزی کی رباعیاں "ترانہ"، جمیل مظہری اور اجتبیٰ رضوی کی رباعیاں، فراقؔ کی رباعیاں "روپ" جوش کی رباعیاں، سیماب کی رباعیاں اور حال ہیؔ میں شاہ حسین نہری کی رباعیوں کا ایک مختصر سا مجموعہ بھی نظر سے گذرا ہے۔ فرید پربتی کے ہم عصر معاصرین میں بھی کئے اچھے رباعی گو ڈاکٹر عبید الرحمٰن اور خالد عبادی وغیرہ نظر آتے ہیں۔ اس دور میں یہ بات اس لئے بھی اہم ہے کہ بعض مغربی اصناف مثلاً ہائیکو وغیرہ نے اردو شاعری پر ایک طرح کی یلغار کر دی ہے جس کی وجہ سے اردو کی بعض روایتی اصناف مثلاً قطعہ اور رباعی وغیرہ پر منفی اثر مرتب ہوا ہے۔ ایسی صورتحال میں رباعیوں کی طرف نئی نسل کے شاعروں کی توجہ لائق تحسین نظر آتی ہے۔ فریدؔ پربتی تو خیر ویسے بھی حسین وجمیل ہیں۔ ان کا تعلق وادیٔ کشمیر سے ہے اس لئے ان کی شخصیت میں بھی وادیٔ کشمیر کے حسن کی جھلک واضح طور پر دکھائی دیتی ہے اور ان کی شاعری میں بھی اور ان کی

دوسری تحریروں میں بھی۔ وہ فطری طور پر جمال پرست ہیں اس لئے حسن و جمال کے مرقعے ان کی تحریروں میں دکھائی دیتے ہیں۔ نثر میں تنقید و تحقیق اور شاعری میں، غزل سے وہ مزاجاً گہری مناسبت رکھتے ہیں۔ وہ ایک ہمہ جہت قلمکار ہیں اور مختلف زاویوں سے قلم کا استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ ''فرید نامہ'' کی رباعیوں میں بھی ان کا انفرادو امتیاز مسلم دکھائی دیتا ہے۔ ''فرید نامہ'' ان کی پانچویں تصنیف ہے اور اس کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ فرید پربتی نے رباعی کی صنف کو ثانوی درجے کی چیز نہیں سمجھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی حسّی جمالیات کی تہذیب و تربیت اور تزئین و ترتیب میں رباعی کے مخصوص آہنگ اور مربوط ساخت نے نمایاں کردار ادا کیا ہے اور غالباً یہی چیز فرید پربتی کا امتیاز و اختصاص متعین کرنے میں وجہ جواز بن گئی ہے۔ فرید پربتی مرحلہ عشق میں جنوں کی حد سے گذر جاتے ہیں لیکن ان کا جنون خرد نا آشنا نہیں ہے۔ خود پسندی، خود پرستی اور خود اعتمادی انہیں وہ قوت عطا کرتی ہے کہ وہ مشکلوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ حقائق حیات کا تجربۂ ذات کی روشنی میں حسن و جمال کا بے مثال مرقع بنا کر پیش کرنے لگتے ہیں اور کامیابی و کامرانی انہیں احساس تفاخر سے ہمکنار کر دیتی ہے:

واقف میں ہر اک خواب کی تعبیر سے ہوں
میں حسن ہوں اور حسن کی جاگیر سے ہوں
کہتے ہیں مجھے یوسفِ ثانی اے دوست
کنعاں سے نہیں وادیٔ کشمیر سے ہوں

یہ ''فرید نامہ'' کا ابتدائیہ ہے۔ حمد اور نعت و مناجات سے پہلے اظہار کی سطح پر اثباتِ ذات کا یہ طریق کار روایت سے انحراف جدت و ندرت کا مظہر ہے، لیکن روایت سے انحراف کی کوشش اکثر ایک نئی روایت کی تشکیل کا پیش خیمہ بن جاتی ہے چنانچہ میں کہہ سکتا ہوں کہ ''فرید نامہ'' کلاسیکی رچاؤ سے پیدا شدہ ایک نئی تشکیل ہے اور ہر لحاظ سے یہ لائق اعتناء اور قابل توجہ اور قابل مطالعہ ہے۔ آرٹ

پیپر کے منقش اوراق پر نہایت ہی خوبصورت گیٹ اپ میں چھپی ہوئی رباعیوں پر مشتمل یہ کتاب حقانی القاسمی جیسے نوجوان نقاد کی تاثراتی جمالیاتی تنقید سے جمال و زیبائی اور برنائی اور رعنائی میں کچھ اور بھی آگے بڑھ گئی ہے۔

●□●

کشمیر میں اُردو شاعری کے پچاس سال

غلام نبی ناظر

فرید پربتی گزشتہ پندرہ برسوں سے شعروشاعری سے وابستہ ہیں۔ بہت کم وقت میں بلکہ اگر کہا جائے کہ ابتدائی کوششوں میں ہی اپنی حیثیت منوانے میں انہوں نے بہت حدتک کامیابی حاصل کی۔ آپ غزلیں لکھتے ہیں اوراب رباعیاں بھی تمام فنی اور عروضی لوازمات کی روشنی میں لکھ رہے ہیں۔

گذشتہ کئی برسوں سے کچھ نئے رجحانات کا ظہور ہوا اور شعراء اپنی خودآگہی کی روشنی میں اپنے زمانے کا پوری طرح سے شعور رکھتے ہیں اور وہ روایتی تصورات سے ناامید ہوکر ذاتی کرب و بحران میں پھنس جانے کی وجہ سے ایک طرف ذہنی طور پر اپنے وجود کی گہرائیوں سے بھی آگاہ ہیں۔ دوسری طرف کائنات کے مختلف مظاہر کی حقیقت سے آگاہی چاہتے ہیں اور یہی جذبہ اوراحساس لیکروہ شعری تخلیقات کو جنم دیتے ہیں۔ افتادگی اور کرب واذیت کا احساس فرید پربتی کے اشعار میں نمایاں ہے تاثر کی شدت اور وحدت غزلوں میں نمایاں ہے اور رباعیات میں وہ اجتماعی محسوسات کو اپنی فنی چابکدستی سے الفاظ کے گلدستوں میں پیش کرتے ہیں۔ فرید اسلوب واظہار انفرادیت کا حامل ہے اور تخیل کا کینواس بہت وسیع ہے۔ ملاحظہ فرمایئے چند شعر۔

یہ کیا کہ شب و روز فقط اُن کی تمنا
یہ کیا کہ محبت کو یہاں کہہ نہیں پاتے

بجھا ہے دل کا کنول عرصۂ بہار میں ہی
شگفتہ پھول کو بادِ صبا نہ راس آئی

(شیرازہ خصوصی نمبر)

''فرید نامہ'' ایک رباعی مجموعہ

ابرار رحمانی

اپنے نام سے ''فرید نامہ'' ڈاکٹر فرید پربتی کی سوانح معلوم ہوتا ہے لیکن دراصل ایسا ہے نہیں۔ یہ فرید پربتی کا مجموعہ رباعیات ہے۔ اس سے پہلے فرید پربتی ابرتر، آبِ نیساں اور اثبات کی پیشکش پر دادِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔ ویسے تو فرید پربتی غزلوں پر بھی دسترس رکھتے ہیں اور اثبات کی غزلوں سے ان کی شناخت قائم ہوئی ہے۔ لیکن میری نظر میں ان کا اصل میدان رباعی ہے۔ رباعی ایک خاص ریاض اور مہارت چاہتی ہے اور جو لوگ محض چار مصرعوں کے جوڑ دینے کو رباعی سمجھتے ہیں، وہ حقیقت میں خود بھی بھٹکے ہوئے ہیں اور اپنی ایسی رباعیوں سے بھولے بھالے قارئین کو بھی بھٹکانے کا کام انجام دیتے ہیں۔

غزل گردی کے اس دور میں فرید پربتی کی یہ رباعیات اردو ادب میں ایک خوشگوار جھونکے کی مانند ہیں جنہیں پڑھ کر یقیناً ایک تازگی اور شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔

آپ اپنے سے لڑتا ہوں، پاگل کی طرح
ہاں کام ملا، جہاد مسلسل کی طرح
ہوں پیاسی زمینوں کا طلبگار فرید
گردش ہے مرے پاؤں میں بادل کی طرح

دنیا کو نیا طور سکھانا چاہوں
چاہت کسے کہتے ہیں ، بتانا چاہوں
خواہش ہے کروں عشق میں اور ایسا عشق
جس عشق میں ہر شئے کو بھلانا چاہوں

فرؔید کی ان رباعیوں میں اظہار ذات بھی ہے اور اظہار کائنات بھی۔ فرؔید کے اس اظہار کو میں کامیاب اظہار سمجھتا ہوں اور قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔

●□●

شعری اُفق کا درخشندہ ستارہ

گلزار صدیقی...... پلوامہ

جموں وکشمیر کے شعری افق پر گذشتہ دو دہائیوں میں جو ستارے روشن ہوئے ہیں وہ اپنی فنکارانہ صیقل سے پہچانے جاتے ہیں۔ اُن درخشندہ ستاروں میں جہاں چند شعراء کی چمک دمک شعری دھرتی کو چار چاند لگا گئے اُنہیں میں ایک درخشندہ ستارہ فرید پربتی ہے جو فکر و احساس کی تازگی اپنے اندر سموے ہوئے ہیں۔

فرید پربتی جدید تر نسل سے ہیں جہاں تک اُن کی شاعری کا تعلق ہے تو وہاں قدیم اور جدید دونوں کا امتزاج نظر آتا ہے۔ لفظیات اگرچہ عامتہ الورود ہیں لیکن نئے طرز سے استعمال کر کے جدت طرازی کا کام معلوم ہوتا ہے۔ انہیں کلاسیکی شاعری پر پوری دسترس حاصل ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اندر ایک منفرد شعری رنگ رکھتے ہیں۔ پرانی لفظیات کو بروئے کار لا کر اور پھر انہیں جدید فکری سانچے میں ڈھالنا ہی اصل میں شاعر کا کمال ہوتا ہے اور اس سلسلے میں فرید پربتی بے حد مہارت رکھتے ہیں۔ فرید پربتی غزل اور رباعی پر یکساں دسترس رکھتے ہیں اور اپنے تخلیقی سر چشموں کی مدد سے انسان کو درپیش مشکلات و مصائب کا ازالہ بھی کرنا خوب جانتے ہیں۔ اُن کے یہاں احساس اور اظہار کے درمیان فاصلے کو کم کرنے کی فکر لگی رہتی ہے۔ خارجی اور داخلی سطحوں پر انسان کے مسائل پر اپنی

بھرپور نگاہ رکھ کر اسے بہترین پیرایۂ اظہار کا جامہ پہنا کر بشری کشمکش کی جھنجھٹ سے آزاد اور مبرا کرنے کی فنکارانہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ احساس اور اظہار کے درمیانی فاصلے کم کرنے کا بہترین اشتیاق اُن کے اندر موجزن ہیں۔ خوابوں کی دنیا بے حد حسین ہوتی ہے جس میں انسان پھولوں کے درمیان خود کو محسوس کرتا ہے خواب کی دنیا اک ایسی دنیا ہوتی ہے جس میں راحت، سکون، آرام، محبت، آرزو وغیرہ سکون پذیر ہوتے ہیں۔ خوابوں کی وادیاں، گل کا کھلنا، بلبل کا چہکنا مراد کرتا ہے اور شاعر بھی خوابوں کی دھن میں محظوظ نظر آتا ہے۔

رنگوں کے تعاقب میں وہ ہے سرگرداں
خوابوں کی بس اک دھن میں رواں ہوں میں بھی

فرید پربتی کے یہاں ایسے الفاظوں کی کثرت ہے جو شعر کے مصرعے کی زیب وزینت ثابت ہوئے ہیں جیسے انگوٹھی میں نگینہ یہی کمال ایک شاعر کا ہے جو الفاظ کو مصرعے کے شکنجے میں فٹ کرا سکے۔ فرد پربتی زندگی کے کٹھن مرحلوں میں جینے کا حوصلہ رکھتے ہیں زندگی کی پر خار راستوں کو وہ گلزار کرنے کا خواہاں بھی نظر آتا ہے۔

فرید پربتی اپنی ایک الگ دنیا رکھتے ہیں۔ جہاں اسے اپنے لئے عسرت سامانیاں نظر آتی ہیں اور ان رنگوں میں آپ بڑے ہی سرمست نظر آتے ہیں۔ وہ اک ایسی خوشی کی تلاش میں ہیں جس میں وہ ہر چیز بھلانا چاہتے ہیں اور دنیا کو اپنی حاصل ہونے والی خوشی ومسرت سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جینے کا اصل ڈھنگ کیا ہے۔ وہ راہ کی تلخیاں و پیچیدگیاں خوب جانتے ہیں اس لئے سنبھل کر چلنا پسند کرتے ہیں اور انہیں ماضی کے دھندلکوں میں رہنا اچھا نہیں لگتا۔ اسی لئے وہ اپنے مستقبل کی تابناکی کے خواہاں نظر آتے ہیں وہ آنکھیں کھول کر نئی منزلوں کو سر کرنے کیلئے جی جان سے سعی کر رہے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ عمر بھر کی چھانی ہوئی خاک کس طرح ان کے لئے سرمہ چشم بن سکتی ہے۔ انہیں عشق سے بیحد عشق

ہے اور قائم کردہ قول و قرار کی سرمستیوں میں جینا پسند کر کے دعا گو ہیں:

قائم رکھیں آسودہ مکاں ، ہم دونوں
اک دوجے پر ہوں مہرباں ، ہم دونوں
چلتا رہے ہمراہ شراب اور کباب
اے کاش رہیں یونہی جواں ہم دونوں

''فرید نامہ'' ان کی رباعیات پر مبنی شعری مجموعہ ہے۔ اس سے قبل فرید نے تین شعری مجموعے تخلیق کیئے ہیں۔ شعر ایسے دلکش انداز میں کہتے ہیں کہ دل کی اتھاہ گہرائیوں میں جا بیٹھتے ہیں۔ فرید پربتی عصری حالات کے موثر اظہار کیلیئے روایتی زبان و بیان کا برتاؤ رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ان کا نفسیاتی وجود اپنی گمشدگیوں، حیرتوں محرومیوں اور آویزشوں کیساتھ ابھرتا ہے۔ یہ نفسیاتی وجود حقیقی زندگی میں اُن کی معصوم خواہشوں اور خوابوں کی شکست و ریخت کے نتیجے میں صورت پذیر ہوا ہے۔ وہ ایک ایسی مثالی زندگی کا آرزومند رہا ہے جہاں صرف اور صرف ٹھنڈی چھاؤں ہی ہو۔ جہاں دھوپ کی تمازت کا گذر بھی نہ ہو۔ ان کی شاعری قاری کو اپنے ساتھ وادیٔ گل کی مہک سے آشنا کراتی ہے۔ چند پل قاری اپنی دنیا سے دور اک ایسی وادی میں جا پہنچتا ہے جہاں صرف اور صرف پھول ہی پھول چارسو ہوں۔ جہاں خطۂ زمین پر سبزہ دور دور تک پھیلا ہوا ہو اور انسان برہنہ پا چلنا پسند کرتا ہے جس وادی کے سبزے پر شبنم کے دھنک جیسے قطرے پیروں میں آکر اُسے اک ایسی روحانی ٹھنڈک دیتے ہیں جس سے اس کی روحانی تشفی حاصل ہو جاتی ہے۔ اس حسین وادی کا ایک منظر یہ بھی ہے

سرتا بقدم جوڑ گئے پھول ہی پھول
ہر شاخ سے وہ توڑ گئے پھول ہی پھول
نازک سا بدن ، ہونٹ گلابی اُس کے
تا حدِ نظر چھوڑ گئے پھول ہی پھول

''فرید نامہ'' میں فرید پربتی کے ایسے تمام تخلیقی منظر نامے ہیں جو کسی سوچے سمجھے موضوع یا خیال سے واسطہ نہیں رکھتے بلکہ اپنے باطن کی گہرائیوں سے ابھرنے والے تخلیقی واقعات کی مصوری کرتے ہیں ظاہر ہے کہ ان کی رباعی یا غزل یکسر معنوی حیثیت رکھنے کے بجائے متعدد معنوی امکانات سے معمور ہو جاتی ہے۔ فرید پربتی کے اشعار پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس طرح کی شاعری بالکل آسان ہے مگر یہ صرف کہنا آسان ہے مگر باعمل لانا قدرے مشکل ہے۔ چنانچہ خود اس بات کو وہ قبول کر چکے ہیں کہ نہ صرف انہوں نے رباعی میں بلکہ غزل میں ایک نیا انداز اختیار کیا ہے۔

وہ غزل ہو کہ رباعی ہو ، دیا تو نے فرید
ایک اک صنف کو انداز بیاں ایک نیا

ان کے اشعار میں معنوی سطحیں بھی ہیں اور معنوی جہتیں بھی۔ اور یہی ان کے کلام کا خاصا ہے کہ چاہے نزدیک سے دیکھیں یا مناسب فاصلہ سے، ہر ایک شعر اپنے اندر ایک نیا عالم سموئے ہوئے نظر آتا ہے۔ نہ ان کے یہاں موضوع کی تنگی کا احساس ہے اور نہ لفظیات کی تنگی کا۔ خواب، تعاقب، لمحات گریزاں، عصر رواں، شفق، جگنو، آئینہ، ریت، شمع، جیسے الفاظ بار بار ان کے یہاں وہ احساس دلاتے ہیں جو انسان کے باطن میں حشر بپا کر دیتے ہیں ان کے اشعار میں موسقیت و نغمگی انسانی وجدان کو زندہ وجاوید بنا دیتی ہے۔ ان کے تخلیقی اظہار اور سوچ کے رنگ بہت منفرد ہیں۔ حقانی القاسمی ''فرید نامہ'' میں یوں رقمطراز ہیں:

''فرید پربتی اپنے شعری طریق اور تخلیقی اظہار میں وحید و فرید ہیں۔ انہیں شعری روایت کی جمالیات کی آگہی ہے اور انسانی اقدار و روایات کا عرفان بھی ہے۔ درد و غم ان کے تخلیقی وجدان کا ایک اٹوٹ حصہ بن گئے ہیں اسی لئے ان کی شاعری میں وہ ساری آوازیں مل جاتی ہیں جو کسی ٹوٹے ہوئے زخمی دل سے آہ کی صورت ابھرتی ہیں''۔

فرید پربتی کے شعری سفر کی محرک ان کے اپنے اندر کی آواز ہے۔ انہوں نے شعری سفر وہاں سے شروع کیا جہاں انہوں نے محسوس کیا کہ انہیں کچھ کہنا ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں نظریات، مشاہدات اور محسوسات کو سیدھے سادے الفاظ میں بیان کرنے کی سعی کی ہے اور اس سلسلے میں انہیں نہ کبھی صلے کی پرواہ رہی ہے نہ ستائش کی تمنا۔ اسی لئے شاید اُن کی شاعری میں فطری والہانہ پن، احساس کی شدت اور جذبوں کا خلوص نظر آتا ہے۔ وہ صدائے باطن کو باہر نکالنے میں فنکارانہ صلاحیت رکھتے ہیں اور روح ارض کی تشنگی کو مٹا کر اسے نہ صرف سیراب کرتے ہیں بلکہ موسقیت اور نغمگی کی فصل بھی بو دیتے ہیں۔ ان کا یہی فکری اسلوب محبت کو تصوف کی راہوں پر لے جاتا ہے۔ ان کے ہاں لب ولہجہ کی شگفتگی بھی ہے اور فکر کی تازگی اور نادرہ کاری بھی جس سے اُن کی شاعری کو ایک خاص رنگ روپ حاصل ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ انتظار کا اپنا ایک الگ مزہ ہے۔ ان کے ہاں یار اور انتظار کے کرب بھی اور وصال کی شیرینی اور لطافت کے جزیرے بھی دریافت ہو جاتے ہیں۔ قاری ان کی شاعری کا مطالعہ کر کے تصور کی دنیا میں موربن کے ناچنے لگتا ہے۔ بقول پروین شاکر۔

تیری چاہت کے بھیگے جنگل میں
مرا تن موربن کے ناچتا ہے

●□●

گفتگو چاند سے......ایک شعری تحفہ

ڈاکٹر فریدہ کول

زیر نظر کتاب فرید پربتی کے لسانی شعور اور غزل شناسی کے اجتہادی رویوں کی عکاسی کرتی ہے۔ تجسیم کاری اور تمثالیت کا اندازِ بیان مثالی نوعیت کا ہے۔ ہر مصرعے میں پوچھا گیا سوال اپنے اندر جواب بھی رکھتا ہے۔ جس سے قاری تذبذب کا شکار نہیں ہو پاتا۔ یہاں فرید کی شاعرانہ شخصیت کے زیر و بم، ان کی خود پسندی، خود شنائی، خود ستائی، نرگسیت اور خود مرکزیت کے آئینے جلوہ فگن نظر آتے ہیں۔

صارفین زدہ معاشرے میں فرید محبتوں، مصلحتوں اور پیار کے دیئے جلانا چاہتے ہیں لیکن ناسمجھی، ناقدری اور بے چہرگی کی ہو کا عالم اسے تڑپاتا اور ترساتا ہے۔ وہ فطرتاً معتدل فطرت کے مالک ہیں لیکن انتہا پسندانہ مخالف سمتوں میں بھی مزاجاً اگر کبھی انتہا پسند بن جانا چاہتے ہیں تب بھی ان کے اس اختیاری رویئے کیلئے ان کا گرد و پیش ہی ذمہ دار ہے۔ جو ان کی طبیعت کے برعکس نظر آتا ہے۔

خموش رہنا یہاں پر ہے بزدلی کی دلیل
ستم گری کو ذرا مورد شکایت کر

تلمحاتی اور اساطیری اسلوب میں فرید بڑی ہوشیار اور فنکاری کو برتتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کبھی غالب، کبھی میر، کبھی حاتم، کبھی فیض اور اقبال کی لفظیات کو اس طرح برتتے ہیں کہ دونوں معنوی اور حقیقی رنگ و آہنگ کی آمیزش

سے انکا منفرد اور جداگانہ اسلوب بن جاتا ہے۔ جو حد درجہ شگفتہ ہے اور انوکھا بھی، جدید بھی ہے، نیا بھی ہے اور نئے سے نیا تر بھی ہے مثلاً ؎

حلقہ حلقہ جس کا نہنگ
نکل آیا ہوں ایسی جال سے میں
خوف اور میں بھی جی رہا ہوں فرید
اس زمانے کا میں حاتم و میر ہوں

فریؔد کی طلسماتی دنیا میں وارد ہو کر ان کے یہاں جذبہ جنون کی تکراری کیفیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ بار بار اپنا عکس دیکھتے ہیں اور ہر بار یہ عکس قارئین کو دکھانا چاہتے ہیں۔ انا پرست فنکار دنیا کی بوقلمونی، زندگی کی رنگارنگی اور سماج کی گونا گونی پر جب قلم اٹھاتا ہے تو اپنے مرکز ذات کے توسط سے اظہار خیال کرتا ہے اور گھما پھرا کر باتوں کو ایک دم اپنے ذہن کے آئینے میں دیکھ لیتا ہے۔ ان کا یہ تکراری لہجہ جہاں خوبصورت تشبیہات اور استعارات میں ڈھکا چھپا ہے۔ وہاں یہ ناصر کاظمی کی شاعری کی طرح درد و کرب اور سوز و گداز کی دھیمی لے اور آہنگ لئے ہوتی ہے ؎

کون آتا ہے مری راتوں کو کرنے معتبر
کون جاتا ہے مری شمعیں دھواں کرتا ہوں

میری فصل کیوں غیر کی ملکیت ہے
یہ باتیں سبھی میں بتاؤں گا اک دن

ماحصل غیر کا میری کھیتوں کی فصل
اک علاقہ ہوں غاصب کی جاگیر ہوں

تمام غم خریدے ہیں اور بیچے خواب
علاوہ اس کے کوئی کاروبار کر نہ سکا

فریدؔ ایک سچے شاعر کی طرح خوابوں کے شیدائی نظر آتے ہیں۔ وہ شہریار کی طرح خواب آفریں عمل سے زندگی کے منفی رویوں سے نبرد آزما ہو جانا چاہتے ہیں۔ بے ایمانی، چاپلوسی، خود غرضی، دھوکہ بازی، مکاری کے سرگرم بازار میں فرید اپنے آپ کو ایک تھکے ہوئے مسافر کی طرح گردانتے ہیں جہاں وہ معاشرے میں رائج کردہ فرسودہ روایات کا تماشا کرتے ہیں اور خود بھی تماشائی بن جاتے ہیں۔

اک تھکا ہارا مسافر سوچتا ہے دیر سے
ساحلِ اُمید پر گھر بنتے بنتے رہ گیا

لے کے نکلا ہوں میں پھر سوختہ خوابوں کا جلوس
خود تماشائی ہوں خود ہی تماشا ہو جاؤں

خوش اعتقاد فرید پربتی شیخ حمزہ، محبوب عالمؒ کی زیارت عالیہ کی گود میں اپنا بچپن گزار کے اب Hill View کالونی رنگریٹ میں قیام پذیر ہیں۔ محبوب عالم شیخ حمزہؒ کی اعتقاد پرستی اور ایقان کی ڈوری کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں۔ آس اور اثر یابی سے زیارت گاہ پر یوں دست بدعا ہوتے ہیں۔

جاتا ہوں شیخ حمزہؒ کے در پہ فریدؔ
بابِ قبول رہتا نہیں ہے وہاں بند

اک لطف کی نگہ کا طلبگار ہے فریدؔ
محروم فیضِ حضرتِ سلطان نہ رکھ مجھے

دراصل ان کے مزاج میں صوفیت اور ریشیت کچھ اس طرح رچ بس گئی ہے کہ انہیں لمحہ بہ لمحہ ولیوں اور صوفیوں کا کرم اور نظرِ عنایت کے طفیل زندگی کی کشتی پار لگنے کی آس رہتی ہے۔

میں چل رہا ہوں صداقت کی سخت راہوں پہ
یہ تیری دین ہے یہ ہے تیرا کرم شاہا

''گفتگو چاند سے'' میں فرید صاحب کی شاعرانہ ہمہ جہتی نکھری ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ ہر رنگ میں اپنے اندر گہرائی اور گیرائی رکھتے ہیں۔ کبھی وہ شوخی رنگ اپناتے ہیں، کبھی بانکپن بن جانے کا اہتمام کرتے ہیں، کبھی وصال پاتے ہیں، کبھی ہجر کے درد و کرب کو سہتے ہوئے نظر آتے ہیں، کبھی ماضی کی حسین یادوں میں کھو جاتے ہیں، تو کبھی آئندہ ان دیکھے خوابوں کے محل سجاتے ہیں۔ یاس میں آس کو اپنا قریبی ساتھی گردانتے ہیں۔ غرض کہ ایک سچے اور کامیاب شاعر کی جو داخلی کائنات ہوتی ہے وہ کبھی بھی ایک ڈگر پر نہیں رہتی ہے۔ اس پر ہلچل، سراسیمگی، لرزاتی، وحشت ناکی، تنہائی، گمشدگی، بے یقینی، بے دلی کی صورت حال کا ہر پل سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اور پھر وہ جو اس گمنام صورتحال کو غزل کی لفظیات کا پیرہن پہننے میں ماہر ہو۔ کیوں نہ کہکشاں شعراء میں اپنے منفرد فکر و احساس سے ضیا افزائی کرے۔ یقیناً فرید صاحب اس عمل میں پذیرائی اور شرفِ قبولیت کا استحقاق رکھتے ہیں۔

قدم قدم پر دیئے شوق کے جلا کے چلے
ہمیں وہ لوگ ہیں جو اپنا سر اُٹھا کے چلے

●□●

”فرید نامہ“ سرسری جائزہ

حسین احمد

ڈاکٹر فرید پربتی ہمارے عہد کے معروف شاعر ہیں ان کی نگارشات ملک اور بیرون ملک کے موقر مجلّات ورسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ان کے تین شعری مجموعے ابر تر ۱۹۸۷ء، آب نیساں ۱۹۹۲ء اور اثبات ۱۹۹۸ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ چوتھا مجموعہ ”فرید نامہ“ میرے پیش نظر ہے جو ان کی دوسو رباعیات پر مبنی ہے۔

اصناف سخن میں رباعی بہت ہی نازک صنف ہے اس کے وزن اور معنی دونوں میں اچھوتا پن ہوتا ہے۔ چار مصرع چار اکائیاں ہوتی ہیں اور چوتھا مصرع پوری رباعی کی جان ہوتا ہے۔ اس کو بہت ہی رواں اور پُر مغز و پُر معنی ہونا چاہئے۔ ڈاکٹر فرید پربتی ”فرید نامہ“ کی تقریباً تمام رباعیات میں اس منزل سے آسانی کے ساتھ گزر گئے ہیں۔ مثلاً

ے شیرازہ محبت کا پریشان ہوا
غارت عیش و سکون کا سامان ہوا
اُس دور میں جیتا ہوں کہ جس میں انسان
وحشی و درندہ اور حیوان ہوا

ے پھولوں سے چرا کر وہ مہک بھیجتا ہے
آکاش کی خوش رنگ دھنک بھیجتا ہے
خالی نہیں رہ سکتا ہوں وہ جانتا ہے
زخموں کیلئے تازہ نمک بھیجتا ہے

طوفانِ حوادث میں بکھرتا ہے وجود
اِک آگ کے دریا سے گزرتا ہے وجود
ہے غول بیاباں کا تعاقب شب و روز
اس تیرہ خاک داں میں ڈرتا ہے وجود

یوں تو ہر شاعر رباعی بھی کہتا ہے لیکن جو بحیثیت رباعی گو مشہور ہوئے ان میں میر انیس ،جگت موہن لعل رواں، یگانہ چنگیزی، امجد حیدر آبادی، فراق گورکھپوری اور اقبال وغیرہ ہیں۔ اگر فرید پربتی اسی طرح رباعی لکھتے رہے تو ان ناموں میں ایک اور نام کا اضافہ ہوگا اور وہ فرید پربتی کا ہوگا۔

●□●

آبِ نیساں......ایک نظر

راجندر بہادر موج

فرید پربتی کی شاعری جموں و کشمیر کی رومان پرور اور کیف آور فضا میں شروع ہوئی اور پروان چڑھی۔ ''آبِ نیساں'' اُن کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔

فرید کی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی کے بہت قریب ہے جسے ہم Realism (حقیقت نگاری) سے تعبیر کرسکتے ہیں جیسے :

کرائے دار سے ہُشیار رہنا
کہیں قابض نہ ہو جائے مکاں پر

خریدوں گا میں اب سایہ کہاں پر
کہ بکتی دھوپ ہے اِک اِک دُکاں پر

انہوں نے غزل کے علاوہ دیگر اصنافِ سخن جیسے نظم، رُباعی اور قطعہ پر بھی طبع آزمائی کی ہے مگر غزل ان کی محبوب ترین صنف ہے۔ وہ ابھی نوجوان ہیں، مگر ان کی شاعری میں زندگی کے عمیق مشاہدے کا پرتو جھلکتا نظر آتا ہے۔ انہوں نے عصر حاضر کی تلخیوں، محرومیوں اور ناکامیوں کو شعری پیکر میں ڈھال کر اُن کی جانب قارئین کو متوجہ کیا ہے۔ اسی لئے اُن کے کلام میں کہیں کہیں قنوطیت کو کافی دخل ہے جیسے:

وقت کے ساتھ ساتھ چلتا ہوں
پاؤں کی بیڑیاں بدلتا ہوں

تیز آندھی میں چراغوں کو جلایا میں نے
اپنی نادانی پہ دنیا کو ہنسایا میں نے

کاغذی ناؤ یہ کیا پار لگائے گی فریدؔ
خود کو نادان تماشا نہ بنا پانی پر

فرید پربتی کی زبان و بیان صاف ستھری ہے۔ اُنہوں نے فارسی اور عربی کی تراکیب کا استعمال نہ کر کے بول چال کے سادہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔

●□●

غزل گوشاعر......فریدؔ پربتی

ڈاکٹر پریمی رومانی

ڈاکٹر فریدؔ پربتی نے شعروادب میں اپنی پہچان منوالی ہے۔ ''ابرتر'' کے بعد اُن کے متعدد شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ جن میں ''آبِ نیساں''، ''اثبات''، ''فرید نامہ'' اور ''گفتگو چاند سے'' وغیرہ قابل ذکر ہیں انہوں نے کشمیر کے ایک بزرگ شاعر شہہ زور (مرحوم) کا کلام بھی مرتب کر کے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ اُن کی غزلیں حسن اور تازگی سے معمور ہیں اُن کی غزلوں میں وہی درد کسک، فرد کی محرومی، موجودہ زمانے کا آشوب اور تڑپ اور گداختگی پائی جاتی ہے۔ فرید غزل کے شاعر ہیں۔ اس لئے اپنے رنگارنگ خیالات کو غزل کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں وہ جدید غزل گو شعراء سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اُنہوں نے روایتی شاعری سے کنارہ کشی اختیار کی ہے۔

''ابرتر'' میں شامل غزلوں میں حسن و عشق کا ایک دلفریب امتزاج ملتا ہے ایسا لگتا ہے کہ محبوب کی اداؤں نے اُن کے دل کو داغ داغ بنا دیا ہے اور اب وہ بے بس ہو کر اختر شماری کرنے لگتے ہیں۔ فرد کی محرومی موجودہ دور کا درد و کرب، تیزی سے بدلتے ہوئے حالات اور آئے دن پیدا ہونے والے مسائل اور اُن کی پیچیدگیاں فرید کے اہم موضوعات ہیں وہ پہلے حالات کا جائزہ لیتے ہیں اور پھر ان

کو تجربات کی سان پر چڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

کہیں نہ سبزہ نہ کوئی نشان پانی کا
نجانے لیکے کہاں مجھ کو آگئی ہے ہوا
یہ نہیں پہچان سکتا ہوں میں اب
تھا کہاں پر شہر میں میرا مکاں

فرید پربتی کی شاعری ابھی ارتقائی منزلوں سے گزر رہی ہے لیکن اس میں جو تازگی اور توانائی ملتی ہے وہ ایک اچھے شاعر کی آمد کا پتہ دیتی ہے۔

●□●

لفظ ''خواب'' کی مختلف تعبیریں

گلزار صدیقی

ڈاکٹر فرید پربتی کے یہاں جو الفاظ بار بار استعمال ہوتے ہیں وہ ہر شعر میں اپنا ایک علیحدہ مقام متعین کر لیتے ہیں مثلاً عمر رواں، بارِ گراں، بادِ خزاں، دھواں، اندازِ بیاں، گل، چمن، پھول، شاخ، عندلیب، دھنک، شوق، دشت، تیر، شب، جگنو، چاند، چراغ، پتھر، کارِ جہاں اور خواب وغیرہ۔ مذکورہ بالا الفاظ کا ہر طریقے سے استعمال کر کے ایک عجیب و غریب فضا قائم کر لیتے ہیں۔ لفظ ''خواب'' کو یہاں دیکھتے ہیں کہ کس طرح سے یہ لفظ ہر شعر کا نگینہ بن کر اپنی چمک دکھا رہا ہے۔

۱. ہر گھنے سائے کو بے نام و نشاں کرتا ہوا
وقت گزرا خواب میرے رائیگاں کرتا ہوا

۲. میں خوابوں کی شمعیں جلاؤں گا اِک دن
زمیں پر ستاروں کو لاؤں گا اِک دن

۳. خوابوں کا اک ہجومِ شکیبائی لے گیا
چھوڑا مجھے مگر مری تنہائی لے گیا

۴. وسوسوں کے شہر میں اپنا مقدّر دیکھ کر
مر رہا تِل تِل ہوں میں خوابوں کو بنجر دیکھ کر

۵. ہر خواب یاد رکھنے کا پیدا سبب کریں
جو آج تک نہ کر سکے وہ کام اب کریں

۶. لے کے نکلا ہوں میں پھر سوختہ خوابوں کا جلوس
خود تماشائی بنوں خود ہی تماشا ہو جاؤں

۷. پنپا نہ کوئی خواب رہی بنجر نگاہ میں
یہ کیا کہ تیرا ساتھ گوارا نہیں کیا

۸. کرنے آیا تھا کوئی خوابوں کو میرے مسمار
اس لئے رات یہاں شور مچا یاد آیا

۹. نہیں دور ہے خواب سے کیوں حقیقت
میں تفصیل اس کی سناؤں گا اِک دن

شعر نمبر ۱. میں وقت کی تیز رفتاری سے شعری کردار محوِ حیرت ہے کہ ہر نام ونشان بے نام ہے۔ معلوم ہی نہیں کہ کسی جگہ بستی اور کہاں جنگل تھا۔ سب کچھ بن جاتا مگر اس ''وقت'' نے میری خواب نگری کا نقشہ ہی اجاڑ کر میرے لئے رائیگاں کردیا۔

شعر نمبر ۲۔ اس شعر میں شعری کردار ہمت وحوصلے کے ساتھ اپنے جی کو تسکین دے رہا ہے کہ حالات جیسے بھی ہوں میں اپنے نقشے کے مطابق اپنی زمین چاند ستاروں سے سجاؤں گا اور خوابوں کی دُنیا آباد کروں گا۔

شعر نمبر ۳۔ اس شعر میں شاعر خوابوں سے دستبردار تو لگ رہا ہے مگر تنہائی کے جانے پر کناں گری کر رہا ہے۔

شعر نمبر ۴۔ میں شعری کردار اُس شہر کا واسی سمجھ رہا ہے جہاں اپنے مقدر کی بگڑتی صورتحال اُسے اُسکے خوابوں کی زمیں کو بنجر بنا رہا ہے اور اس کیلیے جینا دوبھر کر رہا ہے۔ اسی طرح بقیہ اشعار میں بھی 'خواب' اپنا الگ تاثر چھوڑ رہا ہے۔

●□●

اُردو شاعری کی نئی آواز......فریدؔ پربتی

ولی محمد اسیر کشتواڑی

ریاست جموں وکشمیر کے اُردو شاعروں اوراد یبوں کی مختصر سی فہرست میں فریدؔ پربتی ایک مقام رکھتے ہیں۔

فرید پربتیؔ کے تین مجموعاتِ کلام ''اثبات''، ''فرید نامہ'' اور ''گفتگو چاند سے'' بالترتیب ۱۹۹۸ء، ۲۰۰۳ء اور ۲۰۰۵ء میں یکے بعد دیگرے شائع ہوکر اُنہی کی وساطت سے میرے پاس پہنچے۔ یہ تینوں مجموعے تزئین، طباعت اور مواد کے اعتبار سے کافی خوبصورت اور لائقِ غور و مطالعہ ہیں۔ میں نے اُردو کے ایک قاری کی حیثیت سے اِن دلکش تصنیفات کا گہرا مطالعہ کیا تو مجھے فریدؔ پربتی کی شاعرانہ عظمتوں کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہوگیا۔

''اثبات'' میں محمد یوسف ٹینگ، پروفیسر محمد زمان آزردہؔ اور پروفیسر قاضی عبیدالرحمان ہاشمی اور محمد صدیق نیاز مند کے تاثرات شامل ہیں۔

ٹینگ صاحب سے لیکر صدیقِ صاحب تک اِن چاروں تذکرہ نگاروں نے اس بات پر اتفاق رائے کیا ہے کہ فرید پربتی جدید ترین اُردو شاعروں کی صف میں ایک منفرد مقام قائم کرنے میں کامیاب وکامران ہیں اورابھی اُن کی پوری عمر شعر و شاعری کی آبیاری کیلئے باقی ہے۔ ''اثبات'' کے آغاز میں متذکرہ بالا مضامین کے بعد حمد، نعت اور دعا بھی شامل ہیں۔ وہ اس طرح ہیں

یکتا بھی یگانہ بھی مشہود و مآل
یکتائی میں تحلیل ہوا عزّ وجلال
حیران تفکر ہے تحمل نگراں
دریا میں ہوا غرق مرا جامِ سفال
(حمد)

ایمان سے پُرنور محمدؐ نے کیا
ہاں بیت المعمور محمدؐ نے کیا
دُنیا سے مٹا شرک کہ تھا حرفِ غلط
توحید کو مشہور محمدؐ نے کیا
(نعت)

بے زور ہوں کچھ زور عطا کر مجھ کو
بے طور ہوں کچھ طور عطا کر مجھ کو
جنگل ہوں عطا کر دے مجھے شادابی
برسات ہوں اک مور عطا کر مجھ کو
(دعا)

رومؔی ہوں نہ رازؔی ہوں نہ خیامؔ وسعیدؔ
ہوں ذرۂ ناچیز کہ ہے نام فریدؔ
قدرت سے تری اُٹھتا ہے صحرا میں حُباب
ذروں سے اُگا دیتا ہے لاکھوں خورشید
(دُعا)

مذکورہ بالا حمدیہ، نعتیہ اور دعائیہ اشعار فریدؔ پربتی کے دینی مطالعے اور اُن کی قوتِ ایمانی کے مظہر ہیں۔ انہوں نے رباعیات کے کوزے میں اِک بحرِ بے کراں کو فنی چابکدستی سے بند کیا ہے۔ یہی سہل بیانی اُن کی قادر الکلامی اور فنی مہارت کی دلیل ہے۔

شاعر سماج کا دِل ہوتا ہے۔ اس لئے آس پاس کا ماحول شاعر کی شاعری پر اپنی گہری چھاپ ڈالتا ہے۔ خوشی اور غمی کے واقعات و حادثات ایک اچھی شاعری میں فنکارانہ انداز میں بیان ہوتے ہیں اسی لئے وادیٔ کشمیر میں نامساعد حالات کو شاعر نے بڑی چابکدستی سے بیان کیا ہے۔

برباد ہوا صحنِ چمن ، رقص میں ہوں
ویرانہ بنا اپنا وطن ، رقص میں ہوں
اب کے نہیں ارتباطِ روح وتن باقی
رہ بر ہے، بشکل راہ زن، رقص میں ہوں

☆

شیرازہ محبّت کا پریشان ہوا غارت عیش و سکون کا سامان ہوا
اُس دور میں جیتا ہوں کہ جس میں انساں وحشی و درندہ اور حیوان ہوا

☆

ہاتھوں میں نہ ہے کس، نہ بازو میں زور جینے کا سلیقہ ہے، نہ مرنے کا طور
ہر شخص ہے بیزار یہاں آپ اپنے سے کیسا یہ زمانہ ہے، یہ ہے کونسا دَور

اِن چند شعروں میں فرید نے کشمیر کی تباہی کا دلدوز منظر بڑی مہارت کے ساتھ کھینچا ہے۔ شاعر نے خوبصورت الفاظ کو خوبصورت انداز میں پیش کر کے اپنی فنی بلندیاں واضح کی ہیں۔ اُن کے رونے میں جذبات کی رو کو اُن کی عقلِ سلیم صحیح سمت دکھاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ فارسی کے الفاظ ہونے کے باوجود اُن کے شعروں میں استعمال شدہ لفظ اُردو کے اپنے لفظ لگتے ہیں اور یہ متناسب تراکیب فریؔد کی شاعری کے حسن کو دُوبالا کرتے ہیں۔ اس طرح یہ اشعار قاری کے ذہن پر دباؤ ڈالنے کے بجائے ایک خاص دلی اور ذہنی فرحت بخشتے ہیں۔ یہ اس بات کا بھی ٹھوس ثبوت ہے کہ شاعر اپنے مافی الضمیر کو من وعن شعری قالب میں ڈھالنے کے فن پر اچھی دسترس رکھتا ہے۔ فرید کا شعری اسلوب روایت اور جدّت کا ایک رنگین و دلکش امتزاج پیش کرتا ہے جس پر شاعر کو خود بھی فخر ہے۔ انہیں اپنی شاعری میں کسی اور شاعر کی ملاوٹ نہ ہونے کا دعویٰ ہے۔ جبھی تو وہ کہتے ہیں

یہ زمیں میں نے نکالی ہے نئی تازہ فرید اسلئے ڈر نہیں مصرع نہ کسی سے لڑ جائے

☆

شگفتہ لہجے میں ہم سے ہوا وہ محوِ کلام یہاں آیا تھا فریؔد الحبیب آخر شب

اثبات میں ۱۲۳ رباعیاں، ۱۵ غزلیں، چند قطعات اور تضمینات شامل ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ شاعر نے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے اور انہیں ان سبھی اصنافِ سخن کے ساتھ ذہنی مناسبت رہی ہے۔

اگرچہ فرید پربتی کو رباعیاں کہنے میں کافی لطف آتا ہے مگر اُن کی غزل

بھی کافی اچھی اور جاندار ہے۔ وہ غزل کے تقاضے پوری طرح مدِ نظر رکھتے ہیں۔ انہیں قدیم اور جدید غزل گو شعرا کا مطالعہ رہتا ہے۔ اُن کی غزل گوئی کا بھی ایک الگ انداز ہے۔ انہوں نے چھوٹی بحر میں تجربے کر کے یہ ثابت کر دیا کہ چھوٹی بحروں میں بھی بڑے بڑے مضامین باندھے جاسکتے ہیں۔ اگرچہ فرید غزل میں عام طور پر سہل ممتنع سے کام لیتے ہیں۔ فرید کی اردو غزل دورِ حاضر کی اُردو غزل کا ایک خوشنما نمونہ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اب اُسی شہر میں کرتا ہوں طلب جائے اماں
لوگ جس شہر سے جان اپنی بچا کر نکلے
شوخ جھونکا تھا صبا تھا کہ تھی چلتی مقراض
جتنے طائر تھے چمن میں سبھی بے پَر نکلے

☆☆

مجھ کو اپنے سوا لگتا نہیں بہتر کوئی
ماوراءِ رنگ و ملمع سے ہے فطرت میری
کہ حمایت کیلیئے آئے گا لشکر کوئی
میری ہر جیت نے رُخ بدلا اسی منطق پر

☆

ایک دن ہونا ہے مجھ کو کامیاب
راستوں کے پیچ و خم بتلا گئے

فرید پربتی ریاست کے پہلے اُردو شاعر ہیں جن کے رباعیات کے دو عمدہ مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ فرید نامہ کے سرورق کے اندرونی فلیپ پر پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، شمس الرحمٰن فاروقی، کرشن کمار طور اور پروفیسر بشیر احمد نحوی جیسے معتبر قلمکاروں کے تاثرات ہیں جن کو پڑھ کر فرید پربتی کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ ”فرید نامہ“ کے ابتدائی صفحات پر فرید صاحب کے خود اپنی شعر گوئی سے متعلق خیالات درج ہیں۔ اُنہوں نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ رباعی کے فن پر بھرپور معلومات فراہم کی ہیں۔ وہ تحریر کرتے ہیں: ”اُردو ادب میں رباعی نے اپنا چراغ فارسی کے چراغ سے روشن کیا ہے۔ رباعی صنف نظم میں خاص

اہمیت رکھتی ہے۔اس صنف میں اختصار کے ساتھ جامعیت کی جو صفت نظر آتی ہے وہ دیگر اصناف میں مفقود ہے۔رباعی دراصل شخصی ایجاد نہیں بلکہ یہ لوک گیت کی نہایت ہی قدیم صنف ہے جو ترقی کر کے اعلیٰ شاعری کی صنف بن گئی۔ رباعی جس طرح ایرانی الاصل ہے اسی طرح اس کے اوزان بھی ایرانی زا ہیں اور اہل فن نے بحرِ ہنرج (مفاعیلن۔چار) سے اختراع کئے ہیں۔اُردو ادب میں رباعی کا وافر سرمایہ موجود ہے مگر جس طرح وقتاً فوقتاً غزل کا انتخاب عمل میں لایا گیا ہے اس طرح کا سلوک رباعی کے ساتھ روا نہیں رکھا گیا ہے۔اس وجہ سے رباعی پسماندگی کا شکار ہو چکی ہے۔ اگرچہ میں زبان و عروض کے بنیادی نکات سے حتی الوسع واقفیت رکھتا ہوں مگر میں نے اپنی عروض دانی کو اپنی شاعری پر حاوی ہونے نہیں دیا کیونکہ میرے نزدیک شعریت ہی شاعری کی اصل روح ہے"۔

فرید پربتی کی رباعیات میں چونکہ کلاسکیت اور جدیدیت کا عمدہ امتزاج موجود ہے اس لئے وہ ماضی اور حال کے دونوں شعری صورتیں مدنظر رکھ کر شعر گوئی کرتے ہیں۔رباعی میں قیامت کا اختصار ہونا تو قدرتی بات ہے۔فرید پربتی کو اُردو زبان پر اس قدر عبور حاصل ہو گیا ہے کہ وہ من پسند الفاظ کے برتاؤ میں کسی بھی قسم کی دقت محسوس نہیں کرتے۔اُن کی نظر بلند اور اُن کے خیالات کافی حد تک نرالے اور اچھوتے ہیں۔ مثلاً یہ رباعیاں ہی لیجئے اِن میں کس قدر نت نئے مضامین فنکارانہ مہارت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں

واقف میں ہر اک خواب کی تعبیر سے ہوں	میں حسن ہوں اور حسن کی جاگیر سے ہوں
کہتے ہیں مجھے یوسفِ ثانی اے دوست	کنعاں سے نہیں، وادیٔ کشمیر سے ہوں

☆

روشن کبھی ہو جائینگے دِن رات مرے	لائینگے ثمر نعت و مناجات مرے
مجھ کو بھی فقط اُسکے کرم پر ہے نظر	ہیں مدِ نظر اُسکو بھی حالات مرے

☆

بازار کے معیار کو اب تول ذرا
خاموش ہے کیوں بول ذرا بول ذرا
تازہ ہیں مضامین نئی طرزِ ادا
اے فکرِ رسا بندِ قبا کھول ذرا

☆

اکثر میں یہاں آگ کی خاطر آیا
ہاں دائرہ عقل سے باہر آیا
لوہے کے چنے چبانا ہے عشق فرید
جو کر نہ سکا میں وہی کر آیا

''فرید نامہ'' کا بغور مطالعہ کرنے پر مصنف کی قادر الکلامی کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔

''فرید نامہ'' کی اشاعت کے صرف دو سال کے بعد فرید اپنی تازہ ترین اُردو غزلوں کا ایک خوبصورت گلدستہ ''گفتگو چاند سے'' لیکر منصۂ شہود پر آئے۔ مشہور و معروف نقاد پروفیسر قاضی عبید اللہ ہاشمی نے اس کا پیش لفظ لکھا ہے۔ وہ فرید پربتی کی غزلیہ شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں ''فرید پربتی کو پڑھ کر خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جنہوں نے بیک وقت ایک بہت اچھے شاعر اور نثر نگار کی حیثیت سے اپنی انفرادیت اور شناخت قائم کی۔ فرید اور خلیل دونوں نے غزل سے نسبتاً زیادہ سروکار کھا ہے لیکن نظم بھی کہی ہے اور نثری مضامین کی حد تک صرف ادبی تنقید لکھی ہے۔ مجموعہ کا عنوان اگرچہ رومانی ہے لیکن شعری کائنات کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ رومانس کسی محدود معنی میں نہیں ہے اس میں وسعت اور فراخی ہے۔ یہ زندگی اور اس کے بیشمار مظاہر و ممکنات سے گہرے تعلق اور سروکار سے عبارت ہے۔ انکے شعروں کی وساطت سے شاعری کی منفرد فنی و تخلیقی بصیرت، گہرے جمالیاتی شعور اور احساس اور رومانی اضطراب کی خوبصورت ترجمانی ہوتی ہے''۔

فرید پربتی کے اس دعویٰ کے باوجود کہ اُنہوں نے اپنے اوپر صوفیت کو حاوی ہونے نہیں دیا۔ اثبات، فرید نامہ اور گفتگو چاند سے تینوں مجموعاتِ کلام میں تصوف کا ایک خاص حصہ ہے جسے انہوں نے اپنے منفرد انداز میں شعری صورت عطا کی اور اپنے صوفیانہ خیالات کو ظاہر کیا۔ اُنہیں حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ جنہیں

سلطان العارفین کا لقب حاصل ہے، کی والہانہ عقیدت ہے۔ عقیدت کی یہ خوبصورت نمائش اُن کے درج ذیل اشعار سے ہوتی ہے ۔

بے برگ و بے نوا ہوں پریشاں نہ رکھ مجھے
اس چلچلاتی دھوپ میں عریاں نہ رکھ مجھے

اپنوں نے مجھ کو ڈال دیا اندھے کنویں میں
مفلس کا مال ہوں سرِ نسیاں نہ رکھ مجھے

اک چشم کیمیاء کا طلبگار ہے فریدؔ
محرومِ فیض حضرتِ سلطانؒ نہ رکھ مجھے

فریدؔ پربتی کی نعتیہ شاعری کا بھی اپنا اسلوب اور خاص رنگ ہے۔ عقیدت کے چراغ، لفظ لفظ بلکہ حرف حرف سے روشن ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ اشعار ۔

کوئی رسول نہ آئے گا اب رسولؐ کے بعد
نہ کوئی پھول کھلے گا اس ایک پھول کے بعد

ترے حدیث و سنن میرے جزوِ ایماں ہیں
حصول اپنا سمجھتا ہوں اس حصول کے بعد

زمین سخت تھی پھر بھی کہی ہے نعت فریدؔ
گناہ بخش دیئے جائیں گے قبول کے بعد

فریدؔ شہدائے کربلا بالخصوص امام عالی مقام حضرت حسینؑ کے جہادِ فی سبیل اللہ کے احترام میں بھی گلہائے عقیدت نچھاور کرتے رہے ہیں۔ آلِ رسولؐ کے ساتھ اپنی دلی محبت کا برملا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

نبیؐ نے گود میں پالا ہے تربیت بھی کی
اب اور کیا میں کہوں تو ہے محترم شاہا

میں چل رہا ہوں صداقت کی سخت راہوں پر
یہ تیری دین ہے یہ ہے ترا کرم شاہا

فریدؔ عصر رواں بھی ہے کربلا آثار

یزیدِ وقت کا انجام دیکھنا آگے

فریدؔ پربتی غزل کے عاشق ہیں اور حسن و عشق کا ایک خاص عنصر موجود ہے۔ چونکہ وہ جدید غزل کی جانب جھکاؤ رکھتے ہیں اس لئے اُن کی غزلوں میں عشقیہ مضامین سے زیادہ غمِ دوراں کی باتیں جگہ گھیری ہوئی ہیں۔ اگر ان کی غزلیات کو اُن کے پس منظر میں پڑھا اور سمجھا جائے تو واقعاتِ کشمیر کی ایک اچھی سی تاریخ بن سکتی ہے۔ چونکہ انہیں رباعیات کی سی اختصار پسندی مرغوب ہے اسلئے بسا اوقات عام قاری کو اُنکے مافی الضمر کو سمجھنے میں دشواری آتی ہے۔ معیار کافی بلند ہے اور کچھ ٹھیٹھ اُردو اور فارسی کے الفاظ جنہیں آج کا قاری سمجھنے سے قاصر ہے، اُنکی غزل کو پڑھنے اور سمجھنے کیلئے تھوڑی بہت ذہنی مشقت کرنا پڑتی ہے۔

لگ گیا امرت کے بدلے وِش پلانے پھر فرید

دیکھ کر اس بات کا مجھ کو وہ عادی خوش ہوا

فریدؔ بھول گیا اپنا لب و لہجہ اب

وہ شعر کہنے لگا ہے ثقیل راتوں رات

☆☆

خواہشوں میں آ گیا ہے اب توازن اے فریدؔ

پاؤں پھیلانے لگا ہوں میں بھی چادر دیکھ کر

تیز آندھی سے دیئے اب کے بچانے کو فرید

خود کو رکھے گا سرِ راہ گذر جانتے ہیں

کشمیر کے گرد و پیش اور لیل و نہار کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ شاعر کا حساس دل، اپنے معشوق کی یادوں میں غلطاں دکھائی دے رہا ہے۔ وہ بھی ہجر و وصال، امید اور نا اُمیدی، مسرت اور غمی، خواب و خیال، صبر و ناصبری، دِل جمی اور بے بسی وغیرہ مضامین کو باندھ کر ایک اچھے عاشق ہونے کا ثبوت پیش کرتے

ہیں۔ یہ الگ بات ہے اُن کا لب ولہجہ مختلف ہے۔ مثلاً یہ اشعار ۔

کوئی بتا کے گیا تھا پلٹ کے آؤں گا
اس اک اُمید میں شمعیں جلائے دیتا ہوں
عجیب حال پریشان ہوں دیکھ لو مجھ کو
کوئی سنے نہ سنے میں بتائے دیتا ہوں

سخن سخن میں کھلاتا ہے پھول جو اکثر
ہوا ہے رنج بہت اُس کی بات سے مجھ کو
جو نقدِ جاں کی طلب ہو تو شوق سے دے دوں
نواز دینا وفا کی زکات سے مجھ کو

فریدؔ نے زندگی کی کتاب کا ایک عمیق اور تقابلی مطالعہ کر کے جو نتائج اخذ کئے ہیں، انہیں جگہ جگہ اپنے شعروں کی لڑی میں پرویا ہے۔ شیریں اور شفاف لفظوں کی صورت میں انہیں اخلاقی اقدار میں رونما ہوئی کمی پر بھی طنز کیا ہے۔ مہر ووفا کو بھی ماضی کا دور تصور کرتے ہیں۔ مادہ پرستی کے دام میں گرفتار انسانوں کی عقل پر بھی قہقہہ مارتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں ۔

یہ بھاگ دوڑ علامت ہے زندگانی کی
ٹھہرے لمحوں کی خاموشیوں سے بچ کے چل
کتابِ زیست کا ہر صفحہ بے نشاں رکھ کر
اب اس طرح نہ خطا پوشیوں سے بچ کے چل
ہے طعنہ زن وہی بیداریوں پہ اب کے فریدؔ
جو کہہ رہا تھا کہ بے ہوشیوں سے بچ کے چل

''گفتگو چاند سے'' کے آخر میں اُن کی دو نظمیں ''نروان'' اور ''شہر آشوب'' بھی شامل ہوئی ہیں۔ نروان ایک مختصر مگر جاندار نظم ہے۔

دوسری نظم ''شہر آشوب'' بہت طویل اور قافیہ بند نظم ہے جس کو پڑھ کر شاعر کی نظم نگاری پر دسترس کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ اس نظم میں مضامین کی فروانی اور لفظوں کی روانی توجہ طلب باتیں ہیں۔ یہ نظم شاعر کی حب الوطنی کی بھی روشن دلیل ہے۔ وہ فرماتے ہیں

تری طرف جو کبھی غیر کی نظر اُٹھتی
مری وفائیں اُسے نوچ کھانے کو مچلیں
ہوا ہے روزنِ ماہِ تمام بے رونق
رہا نہ یا وہ چاہت کا بھیگتا موسم
رُکے تھے کتنے ہی لمحوں کو جاوداں کرلیں
چلے کہ عزم تھا دامن ترانہ چھوڑیں گے
مگر چلی ہے یہاں تیز تیز اک آندھی
اُجاڑ ہوگئے راستے محال ہوگئی زیست

☆

قدم قدم پہ تمنائیں دم بہ خود ہیں یہاں
تلاش کرتا ہوں کب سے وہ دلنشیں ساعت
وہ خوشبوؤں سے نکھرتا ہوا بدن اُس کا
میں واہموں میں گرفتار ہوگیا اتنا
یہ سوچتا ہوں کوئی لمحہ جاوداں ہی نہیں
یہاں پہ مانگیئے کس سے سکون کی خیرات
یہاں کرونگا اب اپنے سوا میں کس سے بات
میں خود ہی آنکھ ہوں خود ہی قدم ہوں خود ہی بات
ہر اِک سوال کہ ریگِ رواں کی مانند ہے
ہر ایک سلسلہ وہم و گماں کی مانند ہے

ابھی تک فرید صاحب کی دیگر مطبوعات ''ابرِ تر''، ''آبِ نیساں''، ''شہہ زور کاشمیری'' اور ''انتقاد و اصلاح'' کا مطالعہ کرنے کا موقع نصیب نہیں ہوا۔ اس لئے پڑھے بغیر اُن کے بارے میں کوئی رائے دینا اندھیرے میں تیر پھینکنے کے مترادف ہے۔ البتہ شاعر موصوف کی تصانیف کی تعداد ہی سے اُردو شعر و ادب کے تئیں اُن کی قابل قدر خدمات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ''شاعر'' جیسے معیاری رسالے کا ایک خصوصی نمبر شائع ہونا ہی اس بات کی روشن دلیل ہے کہ فرید اب کشمیر کے پربتوں سے نکل کر برصغیر کے میدانی علاقوں میں بھی اپنی شناخت بنا چکے ہیں۔ اُن کی شاعری کے عاشق اب اُردو دُنیا کے ہر کونے میں موجود ہیں۔ خدا انہیں صحت کامل دے تا کہ وہ شعر و ادب کی اور بھی آبیاری کرسکیں۔

●□●

فریدؔ پربتی کے مضامین...... چند اقتباسات

رؤفؔ راحت

ا-ولیؔ کے دیوان کی مثال ایک گلِ سبد کی سی ہے جس میں ہمہ رنگ پھول موجود ہیں ایک طرف سادگی ہے دوسری طرف صنائع بدائع کی رنگ آمیزی بھی۔ تشبیہ استعارہ، تجنیس، تلمیع، حسنِ تعلیل، تجاہل عارفانہ، صفتِ عکس، ایراوالمثل مراۃ النظیر، ایہام وغیرہ۔ ان کےؔ ہاں فنی اثر اور روانی میں اضافہ کرتے ہیں۔ صنعت ایہام کو جس خوبی سے ولی نے استعمال کیا ہے۔ بہت کم شعراء وہاں تک پہنچ سکے ہیں۔ یہی خصوصیت تھی جس کو شمالی ہند کے شعراء کی پہلی نسل نے ولیؔ کی شاعری کی بنیادی صفت مان کر زمین وآسمان کے قلابے ملا دیئے۔

(شاہ حاتم کی شاعری)

۲-صاف گوئی کی تحریک (جسے جمیل جالبیؔ نے ردعمل کی تحریک سے موسوم کیا ہے) نے اس دور کی اُردو شاعری کو صنعتِ ایہام کی قید بے جا اور تنگنائے سے آزاد کرکے نئے امکانات سے روشن کیا اور اس کے سامنے وسیع راستے کھول دیئے۔ فارسی شاعری کا وہ حصہ جو ایہام کے رواج کے باعث عدم توجہی کا شکار تھا اور اُردو شاعری کی دسترس میں آگیا۔ اس کے ساتھ فارسی شاعری کے سارے اسالیب اور اصناف اُردو شاعری کے لئے قابل قبول ہوگئے۔ اور ایک پختہ کار زبان کی شاعری اور اسکے تمام موضوعات تصوف، وارداتِ عشق،

اخلاقیات، خمریات، رندی و درویشی، حیات و کائنات کے مسائل بھی اس کے تصرف میں آ گئے۔ یہ اتنی بڑی تبدیلی تھی کہ اس نے اردو شاعری کا رخ بدل دیا اور میر، سودا اور درد جیسے شاعروں کے لئے راستہ صاف کر دیا۔ شاعری تلاشِ الفاظ کے بجائے جذبات و واردات کے فطری و بے ساختہ اظہار کا ذریعہ بن گئی۔ دوسری بڑی تبدیلی شعر کی زبان میں آئی۔ ولی دکنی کی زبان کے بجائے شاہِ جہاں آباد کی اُردوئے معلّٰی نے لے لی اور اُن ہی اصولوں کی پیروی کی۔

(شاہ حاتم کی شاعری)

۳- اب سوال یہ بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ عین ممکن ہے کہ میر نے اس شعر کے متن میں تحریف کی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو میر حسن کا تذکرہ جو خاکسار اور میر کی زندگی میں ہی لکھا گیا تھا ضرور اس کی طرف اشارہ کرتا۔ اس طرح جب ہم اصل متن کی روشنی میں میر کی اصلاح کا جائزہ لیتے ہیں تو انکی اصلاح اور انکی توجہ یک طرف اور برائے نام نظر آتی ہیں۔ کیونکہ مصرع اولیٰ کی بندش و ترتیب کو مدنظر رکھتے ہوئے دوسرے مصرع میں 'ہی' حرف تاکید کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ معشوق کی آنکھوں کا مذکور ہے اسلئے مضمون بندش، ترتیب اور وزن شعر کی مناسبت سے "بیمار" صحیح اور برمحل لفظ استعمال ہوا چونکہ سیماب وغیرہ اصلی متن کا تعین نہیں کر سکے ہیں اسی وجہ سے وہ صحیح اور برمحل لفظ استعمال ہوا چونکہ سیماب وغیرہ اصل متن کا تعین نہیں کر سکے ہیں اسی وجہ سے وہ صحیح نتیجہ اخذ کرنے سے قاصر رہے ہیں اور جس طرح میر نے مرزا جان جاں مظہر کے گروہ کے خلاف رواروی میں سرسری اور بے دلیل فیصلے صادر کئے ہیں اس طرح سیماب اور بعد کے ارباب نقد و نظر نے زیر بحث شعر کے ساتھ یہی سلوک روا رکھا ہے۔

(خاکسار کے ایک شعر پر میر کی اصلاح)

۴- اصلاح عربی لفظ ہے جس کا لغوی معنی صحت، مرمت، ترمیم و تصحیح کے ہیں۔ صلح

(باب کَرُمَ ۔یکرُ وُمُ) جو ثلاثی مجرد ہے اسکا مادہ ہے۔ جس کے معنی درست وٹھیک ہونا، خرابی دور ہونا ہیں جیسے صَلُحَ فی عَمَلِہٖ۔ اصطلاحِ شعر میں کلام کو لفظی، معنوی، ترتیبی وترکیبی عیوب ونقائص سے بے عیب بنانے کا نام اصلاح ہے۔ اصلاحِ سخن کی روایت اُردو شاعری کی تاریخ کی ایک دیرینہ اور مستحکم روایت ہے۔ اُردو میں یہ روایت ابتدا ہی سے پائی جاتی ہے یہ روایت ہمارے یہاں براہ راست عربی وفارسی سے منتقل ہوئی ہے۔ یہ روایت ایشائی شاعری کو باقی ماندہ زبانوں کے شعری ادب سے بالکل علیحدہ کرتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک منفرد روایت ہے۔

(اُردو شاعری میں اصلاحِ سخن کی روایت)

۵- شمالی ہند میں اصلاحِ سخن کی روایت حقیقی معنوں میں شاہ حاتم کے ہاتھوں مستحکم ہوئی۔ شاہ حاتم کے معروف تلامذہ میں سودا، رنگین، تاباں، بیدار، نثار وغیرہ نام قابلِ ذکر ہیں۔ اصلاح شعر کی یہ روایت سودا، شاہ نصیر، اور ذوق سے ہوتی ہوئی فصیح الملک داغ دہلوی اوران کے تلامذہ تک پہنچ جاتی ہے جو ابھی تک کسی نہ کسی صورت میں جاری وساری ہے۔ روایت کا یہ سلسلہ سودا، شاہ نصیر، ذوق اور داغ سے ہوتا ہوا اُس منزل پر پہنچ جاتا ہے جس نے آگے چل کر نہ صرف شمال اور دکن کی دیوار گرا کر دونوں کو گھر آنگن بنا دیا ہے بلکہ دونوں کو ایک میعار ومزاج عطا کیا۔ اس سلسلے میں آخری کڑی فصیح الملک داغ دہلوی ہیں جو دلّی، رامپور، دکن وغیرہ جگہوں پر زندگی کا بہت سا وقت صرف کر کے اپنے شاگردوں کی ایک ریاست ملکِ سخن کو تفویض کرتا ہے۔

(اُردو شاعری میں اصلاحِ سخن کی روایت)

۶- اُردو شاعری میں زبان اور اسکی مزاج شناسی کی روایت کا آغاز شاہ حاتم سے ہوتا ہے۔ یہ روایت ذوق کے توسط سے تعمیہ وتخرجہ کے ساتھ داغ تک پہنچی۔ داغ نے اس روایت کو اتنا آگے بڑھایا کہ انہیں اپنے استاد ذوق اور حاتم پر

فوقیت حاصل ہوگئی۔ موقعہ کی مناسبت سے یہاں پر غالب کا قول نقل کر دینا مناسب ہوتا ہے۔ کہتے ہیں ایک دفعہ غالب نے مومن کے ایک شاگرد نثار علی شہرت سے کہا کہ دہلی والوں کی جو اُردو ہے اسکو اشعار میں لکھنا چاہیئے آخر عمر میں ہماری تو یہی رائے قائم ہوتی ہے۔ پھر شہرت نے پوچھا کہ "داغ کی اُردو کیسی ہے"۔ غالب نے جواب دیا "ذوق نے اُردو کو اپنی گود میں پالا تھا۔ داغ اسکو نہ فقط پال رہا ہے بلکہ اسکو تعلیم بھی دے رہا ہے۔

بعد استاد ذوق کے کیا کیا
شیرت افزاء کلام داغ ہوا

(اردو میں اصلاحِ سخن کی روایت)

۷- ڈاکٹر سلام سندیلوی کا یہ کارنامہ یقیناً اُردو تنقید میں صنفِ رباعی کو توجہ کا مرکز بنانے کے لئے کافی اہمیت کا حامل ہے یہ مقالہ جس کاوش اور صفت کے ساتھ رباعی کی ایجاد، ارتقاء اور اس کے فن کے علاوہ دورِ قدیم، دورِ متوسط اور دورِ جدید کے شعراء کی رباعیات کا جائزہ تاریخی تسلسل کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ وہ ہر لحاظ سے رباعی کی تنقید پر حاوی کارنامہ ہے اردو اور فارسی میں اس موضوع پر اتنا مبسوط کام ملنا اگر محال نہیں ناممکن ضرور ہے۔ رباعی کے ادبی، فنی، اور تاریخی عظمتوں کا ذکر جس سلیقے اور حسن و خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے وہ اس صنف کو استحکام بخشنے کے لئے کافی اہمیت رکھتا ہے۔

زکوئے میکدہ دوش بدوش می براند
امام شہر کہ سجادہ می کشیر بدوش

(ڈاکٹر سلام سندیلوی بحیثیت ناقدِ رباعی)

۸- اسد بدایونی کی شاعری دراصل اظہارِ ذات کی شاعری ہے۔ انکے پورے شعری سفر کو دیکھتے ہوئے یہ بات واضح طور پر نمایاں ہو جاتی ہے کہ اُن کو کسی ایک فکری یا شعری رجحان کیساتھ Commitment نہیں ہے۔ عام طور

پر دیکھا جاتا ہے کہ اپنے لب ولہجہ یا اپنی آواز کی یافت کے لئے کسی بڑی آواز کا سہارا لیا جاتا ہے۔ ہماری شاعری میں ابتداء ہی سے یہ رجحان نظر آتا ہے۔ اسد بدایونی کی شاعری میں عام طور سے کسی لب ولہجے یا آواز یا بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی ارتکاب نظر نہیں آتا اسی وجہ سے ان کی شاعری پر کہیں بھی یا کسی وقت صدائے بازگشت کا گمان نہیں ہوتا ہے۔ اگرچہ انہوں نے اپنی شاعری کی ابتداء ضرور کلاسیکی شاعری کی زیر اثر کی ہے۔ اس طرز فکر اور طرز ادا نے اُنکو سلیقہ مندی اور گیان ضرور عطا کیا ہے مگر وہ پوری طرح ان پر حاوی نہیں ہے۔

(ہارے ہوئے سپاہی کی رجز......اسد بدایونی کی شاعری)

۹- رباعی کے نمونے ہمیں یہاں سب سے زیادہ شہہ زور کاشمری کے یہاں ملتے ہیں۔ شہہ زور اُردو کا قادر الکلام شاعر تھا اور زبردست تخلیقی صلاحیتوں کا مالک شہہ زور کاشمیری سیماب اکبرآبادی سے مشورہ سخن کیا کرتے تھے۔ اس طرح انکی شاعری کا سلسلہ فصیح الملک داغ دہلوی سے ملتا ہے۔ عروض، زبانی کے نکات، محاورہ اور شعری اسالیب پر سیماب کو جو عبور حاصل تھا اس سے شہہ زور نے کماحقہٗ استفادہ کیا ہے وہ غزل کے جتنے اچھے شاعر تھے اتنے ہی نظم کے بھی۔ جہاں تک صنفِ رباعی کا تعلق ہے اگرچہ ان کے یہاں رباعیوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے مگر انہوں نے فنی لوازمات کا خاص طور پر خیال رکھا ہے۔ زبان وبیاں، اسلوب وآہنگ اور موضوعی اعتبار سے اُن کی رباعیاں نظرانداز نہیں کی جاسکتی ہیں۔

(کشمیر میں صنف رباعی)

۱۰- رباعی، جس طرح ایرانی الاصل ہے اس طرح اوزان بھی ایرانی زا ہیں اور اہل فن نے بحر ہزج (مفاعیلن چار بار) سے اختراع کیے ہیں۔ رباعی ''سنطور'' پر گائی جانے والی صنف ہے۔ سنطور ثقیل آوازوں کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ رباعی کے اوزان میں جو لحنیں پیدا ہوتی ہیں انہیں موسیقی کی اصطلاح میں ''ترانہ'' کہا

جاتا ہے چونکہ اس وزن سے پیدا ہونے والی لحنیں فنِ موسیقی میں بڑی پسندیدہ اور ایرانی موسیقی کے مذاق کے عین مطابق تھیں۔ اس لئے ان اوزان کا نام ہی ترانہ رکھ دیا۔

(اُردو رباعی پر ایک نظر)

۱۱- اُردو ادب میں دو ادبی شخصیتوں کا جنازہ بڑی دھوم دھام سے اُٹھا ہے۔ ایک فصیح الملک داغؔ دہلوی کا، جن کے جنازے میں نظام حیدر آباد، میر عثمان خان، وزراء اور اہل کارواں کے علاوہ تقریباً پورا حیدر آباد شامل تھا۔ دوسری مثال ڈاکٹر زورؔ کی ہے ان کے غمگساروں میں خود اس وقت کے وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر بخشی غلام محمد اور ان کے وزراء کے علاوہ ہر طبقے کے لوگ شامل تھے۔

(ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ اور کشمیر)

۱۲- صادقین ایک ہمہ جہت فنکار ہے۔ وہ بیک وقت مصوری، خطاطی، نقاشی اور شاعری کو یکساں سطح پر اپنے تخلیقی اظہار کیلئے استعمال کرتے ہیں اور یہ بتانا بہت ہی مشکل ہے کہ وہ ایک کامیاب مصور ہے یا شاعر۔ خطاط ہے یا نقاش۔ اس فنکارانہ تنوع کے باعث ان کے کارناموں کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے۔ جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے اس میں انہوں نے اپنی طبعی مناسبت کی بنیاد پر رباعی کو ہی وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔ رباعی میں چونکہ فکری تسلسل اور ارتکازِ خیال کی پیوستگی مشق و ممارست کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے، اسی وجہ سے فنی اختصاص حاصل کرنے کیلئے غزل سے زمزمہ سنجی شروع کی جاتی ہے۔ صادقین کا معاملہ اس کے برعکس ہے وہ اپنی طبیعت کو رباعی کے متصل پاتے ہیں۔ یہ ان کی خود آگہی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

(صادقین کی رباعیاں)

فرید پربتی سے مکالمہ

افتخار امام صدیقی

- کیا آپ اپنے لئے لکھتے ہیں یا دوسروں کیلیئے؟

□ ہر تخلیقی تجربہ اظہار سے پہلے انفرادی نوعیت کا ہوتا ہے۔ اظہار کے بعد وہ اجتماعی نوعیت اختیار کر لیتا ہے۔

- کیا آپ کے ذہن میں نئی نسل کی تربیت بھی رہتی ہے!

□ یہ میرے تلامذہ میں سے عرفان عندلیب، رؤف راحت، خورشید عالم خان، سیدین وقار، سلیم سالک کی کاوشیں بتا سکتی ہیں اور احباب میں سے اشرف عادل، لیاقت جعفری، پرویز مانوس، مبشّر رفاعی وغیرہ بتا سکتے ہیں

- کیا آپ آزادانہ سوچ کو پسند کرتے اور لکھتے ہیں؟

□ ہر تخلیق آزادانہ سوچ کا عملی اظہار ہوتی ہے۔

- کیا آپ اپنے فن پارے کی پہلی لکھی شکل سے مطمئن ہو جاتے ہیں؟

□ نہیں، دیوانِ غالب بخط غالب اس کیلیئے ضرور دیکھیئے۔

- کیا فن پارے کو کوئی آخری شکل دینے کے مراحل سے آپ گزرتے ہیں؟

□ یقیناً، میں اگرچہ ادب میں بے ساختہ پن کا قائل ہوں

- وہ مراحل کیا ہے؟ (مختصر مختصر لکھیئے)

□ احتسابی نکتہ نگاہ کا استعمال

- اب تک آپ نے جو کچھ تخلیق کر دیا ہے، کیا اس سے مطمئن ہیں؟

□ میں نے ابھی تخلیق کیا ہی کیا ہے جس سے مطمئن ہو جاؤں۔

- کیا آپ نے کوئی بڑا ادبی کارنامہ انجام دیا ہے؟

□ اپنے ہم عصروں کے دلوں سے فنِ رباعی کی دقاقت کا خوف دور کیا۔

- کیا آپ اپنی سابقہ تخلیقات پر نظرِ ثانی کرتے رہتے ہیں؟

□ جی ہاں۔ یہ فن میں نے غالب، شاد عظیم آبادی اور اقبال سے سیکھا ہے۔

- کیا آپ لکھنے سے قبل بہت غور و خوض کرتے ہیں؟

□ نثر میں، شاعری میں نہیں، آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں

- کیا تخلیقی عمل کیلئے مطالعہ ضروری ہے؟

□ خالص مطالعہ ہی نہیں بلکہ مشاہدہ اور مجاہدہ بھی۔

- کیا آپ اپنے تجربوں اور مشاہدوں کو اپنے فن پاروں میں سموتے ہیں؟

□ جو بھی لاشعور میں ہوتا ہے وہ از خود تخلیقی اظہار پاتا ہے۔

- کیا اب بھی آپ کے ذہن میں کوئی ایسا خیال ہے جسے آپ نے تخلیق نہیں کیا ہے؟

□ یہ لاشعور کے نہاں خانوں میں اترنے کے بعد ہی بتایا جاسکتا ہے جو ناممکنات میں سے ہے۔

- کیا آپ تنقید پسند کرتے ہیں؟

□ یقیناً متوازن اور غیر جانبدارانہ

- کیا آپ قارئین و نقاد حضرات سے مایوس ہوتے ہیں؟

□ قارئین سے نہیں، ناقدان ہمارے یہاں نہ ہونے کے برابر ہیں کیونکہ وہ تنقید کے دائرۂ عمل سے نابلد ہیں۔

- کیا آپ نے لغت سے دوستی کی ہے؟

☐ کونسا لغت، ہمارے یہاں لغت کا تصور صریحاً روایتی ہے۔

● کیا آپ ملکی اور غیر ملکی زبانوں کا ادب بھی پڑھتے ہیں؟

☐ یہی اوڑھنا ہے اور وہ بچھونا میرا

● ملکی زبانوں کے ادب میں چند اہم ترین نام!

☐ میرے نزدیک ہر ادبی نام اہم ہے۔ کیونکہ یہ سب زندگی کو حسین بنانے کے خواب دیکھتے ہیں۔ ردّے پر ردّا جب جمتا ہے تب دیوار بنتی ہے۔

● غیر ملکی زبانوں کے ادب میں چند اہم ترین نام!

☐ یہ معاملہ غیر ملکی زبانوں کا ہے میں زندگی کی طرح ادب میں ماڈل کا قائل نہیں ہوں۔

● کیا آپ اپنے سے بڑی ادبی شخصیت سے مرعوب ہو جاتے ہیں؟

☐ تعین قدر کا مسئلہ بہت پیچیدہ مسئلہ ہے آج کل بڑے اور چھوٹے کے جو معیارات ہیں ان کے سمجھنے سے قاصر ہوں۔ مرعوب کس سے ہو جاؤں

● کوئی قابل ذکر ادبی شخصیت؟

☐ فہرست طویل ہے البتہ ان میں ابوالعلاء معرّی، ناسخؔ اور یگانہ چنگیزی ضرور شامل ہیں۔

● کوئی قابل ذکر ادبی رسالہ؟

☐ اوراق (لاہور)، شاعر (ممبئی)، شعر و حکمت (حیدرآباد)، سب رس (حیدرآباد)

● کیا نثر لکھنا شاعری سے زیادہ مشکل کام ہے؟

☐ تخلیقی اور شگفتہ نثر تقریباً شاعری ہی ہے۔

● کیا آپ کسی مستعار ادبی تھیوری کو اہم جانتے ہیں؟

☐ ادب میں مستعار کچھ بھی نہیں ہے۔ سبھی تھیوریاں اپنی جگہ اہم ہیں اور تہہ در تہہ تخلیقی تجربوں کی ترسیل میں مدد کرتی ہیں۔

- کیا اپنے کلاسیکی ادب کا مطالعہ ضروری ہے؟

□ بے حد ضروری ہے، بقول ٹی ایس ایلیٹ روایت سے روایت بنتی ہے۔

- کیا میر، غالب، اقبال، پریم چند، فیض اور فراق کے علاوہ بھی قابل ذکر نام ہیں؟

□ اُردو ادب کی تاریخ ان سے بھری پڑی ہے۔

- اب تک جو ادبی تاریخیں لکھی گئی ہیں، کیا وہ ہماری ادبی تاریخ کی مکمل نمائندگی کرتی ہیں؟

□ نہیں، کیونکہ وہ ولی کو اُردو ادب کا پہلا صاحب دیوان شاعر بتاتی ہیں اور ان میں نثار، میر محمد بیدار، بقاء اللہ بقا، اور عبدالحی تاباں جیسے شعراء کی کاوشوں کو صحیح طور سے پیش نہیں کیا گیا ہے۔

- کیا ہندوستان میں اردو کا مستقبل روشن ہے؟

□ حیدرآباد کا ادبی منظر نامہ دیکھ کر اور شاعر (ممبئی) پڑھ کر اس پر یقین رکھتا ہوں۔

- کیا کسی عالمی ادبی چینل کی ضرورت ہے؟

□ ضرورت تو ہے مگر Who will bell the cat

- کیا اردو ادب، ملکی و غیر ملکی زبانوں کے ادب کے ساتھ فخر کے ساتھ رکھا جاسکتا ہے؟

□ مستشرقین مثلاً گارسان دتاسی، رچرڈ جونس، گل کریسٹ نے اس کی شروعات بہت پہلے کی ہے۔ یہاں تک کہ گل کریسٹ نے سودا کے چند قصائد کا ترجمہ بھی انگریزی میں کر دیا تھا۔

- وہ فن پارے کیا ہیں؟

□ تخصیص مشکل ہے چند نام خانہ پُری کیلئے لینا چاہوں گا۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ، کفن، انیس کی شاعری، رباعیات امجد، شاد عظیم آبادی نے اپنی

رباعیات کا ترجمہ خود کروا دیا تھا۔ اُسے مغرب والوں نے پسند کیا تھا۔

- کیا آپ کے بچے اردو پڑھتے ہیں؟
- ❑ ابھی تک میرا کوئی بچہ نہیں ہے۔
- کیا انگریزی کی تعلیم ضروری ہے؟
- ❑ ضروری تو ہے مگر مشرقی تعلیم کی قیمت پر نہیں۔
- کیا اُردو ایک اختیاری زبان کے طور پر علاقائی زبانوں کے اسکولوں میں رکھی جاسکتی ہے؟
- ❑ جموں وکشمیر میں رکھی جارہی ہے۔
- کیا اُردو میں خواتین کیلئے کوئی خالص ادبی رسالہ ہے؟
- ❑ نہیں
- نئی نسل کی خواتین میں کوئی اہم نقاد؟ ان کے نام کیا ہیں؟
- ❑ ثروت خان، ترنم ریاض
- کیا الیکٹرانک میڈیا، پرنٹ میڈیا پر حاوی ہوگیا ہے؟
- ❑ حد سے زیادہ
- کیا آپ عشق پر یقین رکھتے ہیں؟
- ❑ اس سے دل کا چراغ روشن ہے
  آنکھ روشن دماغ روشن ہے (داغ)
- آپ نے عشق کیا ہے؟
- ❑ میں نرگسیت کا شکار ہوں۔
  الجھتا ہوں میں اگر دیکھتا ہوں آئینہ
- کیا ایک فنکار کو ایوارڈس وغیرہ کے حصول کی کوشش کرنی چاہئے؟
- ❑ میں حصول کی کوشش پر یقین نہیں رکھتا ہوں کیونکہ میرا نظریہ ہے کہ کام خوشبو ہے۔

- کیا اردو کے اساتذہ اپنی زبان کا ادب پڑھتے ہیں؟
- میں تو پڑھتا ہوں، دوسروں کا نہیں بتا سکتا۔
- کیا وہ اپنے شاگردوں کو اس کی تلقین کرتے ہیں؟
- میں ہر وقت تلقین ہی نہیں تاکید بھی کرتا رہتا ہوں۔
- آپ کے شہر کی اہم ترین اُردو لائبریری کا نام کیا ہے؟
- سری پرتاب لائبریری، علامہ اقبال لائبریری (کشمیری یونیورسٹی)
- آپ کے شہر کے اہم ترین کتب فروش کے نام اور پتے کیا ہیں؟
- (۱) مکتبہ علم و ادب (گاؤ کدل) (۲) شیخ محمد عثمان (گاؤ کدل) (۳) علی محمد اینڈ سنز لالچوک (۴) میزان پبلی کیشنز: بٹہ مالو سرینگر
- کیا اُردو کتب فروش، اُردو کی کتابیں اور رسالے فروخت کرنے میں کوئی خاص دلچسپی رکھتے ہیں؟
- کیوں نہیں
- کیا آپ انکی مدد کرتے ہیں؟
- جی ہاں
- کیا آپ کوئی ادبی رسالہ شائع کرنا چاہتے ہیں؟
- فی الحال نہیں
- کیا ادب اور مذہب میں کوئی رشتہ ہونا چاہئے؟
- میرابائی، برتری ہری، اقبال، انیس، محسن کاکوروی کی طرح کا۔
- اپنی پسندیدہ خوشبو کا نام بتائیے؟
- گلاب کی خوشبو
- کیا ادب، مذہب، سیاست کا رُخ موڑ سکتا ہے؟
- جی ہاں۔ کیونکہ ادب حل نہیں اندازِ نظر دیتا ہے۔
- کس طرح کی موسیقی آپ سننا پسند کرتے ہیں؟

- صوفیانہ موسیقی
- غزل گائیکی کے زوال کے اسباب کیا ہیں؟
- سنجیدہ سامعین کی کمی
- آپ کا پسندیدہ رنگ کونسا ہے؟
- ہر رنگ کیونکہ میں وحدت الشہود کا قائل ہوں۔
- کیا آپ خدا پر یقین رکھتے ہیں؟
- میں تو اللہ والا ہوں
- کوئی قابل ذکر ادبی واقعہ جو آپ کے ساتھ گزرا ہو؟
- معروف و منفرد شاعر پروفیسر مغنی تبسم کے سامنے گفتگو کرتے وقت پہلی بار مجھے احساس ہوا تھا کہ میں زیادہ بول رہا ہوں اور سچا ادیب کتنا خاموش ہوتا ہے۔
- نئی نسل کے وہ قلمکار جن میں مستقبل کے امکانات ہیں۔(نام بتایئے)
- ہر شہر و دیار میں نئی نسل کے ایسے نمائندے ضرور موجود ہیں جن کے یہاں امکانات پائے جاتے ہیں۔فہرست طویل ہے۔نام لکھنے سے گریز کرتا ہوں۔
- نئی نسل کیلئے کوئی اہم پیغام
- یہ بزم مے پرستاں محتسب خوش عزتے دارد
  کہ چوں آید بہ مجلس شیشہ خالی میکند جارا (طاہر غنی)
- نئے ادبی رسائل میں چند ایک ادبی رسائل کے نام لکھئے
- امکان، شاندار
- اُردو میں اصلاحِ سخن کی روایت آغاز و ارتقاء مختصراً
- اصلاح عربی لفظ ہے۔جس کے معنی صحت، مرمت، ترمیم و تصیح کے ہیں۔صلح (باب کرم۔یکرم) جو ثلاثی مجرد ہے اس کا مادہ ہے جسکے معنی

درست وٹھیک ہونا، خرابی دور ہونا ہے جیسے صلح می عملے۔ اصلاح شعر میں کلام کو لفظی، معنوی، ترکیبی عیوب و نقائص سے بے عیب بنانے کا نام اصلاح ہے۔

اصلاح سخن کی روایت اُردو شاعری کی تاریخ کی ایک دیرینہ اور مستحکم روایت ہے۔ اُردو میں یہ روایت ابتداء ہی سے پائی جاتی ہے اور یہ براہِ راست عربی و فارسی سے منتقل ہوئی ہے۔ یہ روایت ایشیائی شاعری کو باقی ماندہ زبانوں کے شعری ادب سے بالکل علیحدہ کرتی ہے۔

عربی میں فن اصلاح پر سب سے اہم اور مصروف کتابیں النقد الشعر، ابو الفرح قدامہ بن جعفر اور کتاب العمدہ۔ ابن رشیق خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ ابوالعباس ابن المعتز عباسی نے سب سے پہلے عربی کے قدیم شعراء کے اشعار سے اخذ کر کے ۲۷۴ھ مطابق ۸۸۷ء میں فن بدایع پر ایک کتاب ترتیب دی۔ اس کے بعد یہ باضابطہ طور پر ایک فن کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

شعرائے پارس نے بھی یہ سلسلہ جاری رکھا۔ انہوں نے نہ صرف اُستاد شاگردی کی روایت کو کافی اہمیت دی بلکہ استحکام بخشنے کیلئے کتابیں بھی تحریر کی۔ اُردو شاعری میں اس روایت کے آثار باضابطہ سب سے پہلے دکنی شعراء کے پائے جاتے ہیں۔ میر حسن نے اپنے تذکرے ''تذکرہ شعرائے اُردو'' میں فخری کو ولی کا شاگرد لکھا ہے۔ البتہ اس روایت میں باضابطہ طور پر ربط و تسلسل شمالی ہند میں پایا جاتا ہے۔ شمالی ہند میں اس سلسلے میں مرزا جانِ جان مظہر اور شاہ حاتم دہلوی اہم نام ہیں۔ مظہر کے تربیت یافتہ شاگردوں میں انعام اللہ یقین، احسن اللہ بیان، قلی خان حسرت قابل ذکر نام ہیں۔ مظہر جان جاں کے متعلق مؤلف سفینہ ہندی لکھتے ہیں کہ '' شاگرداں او بسیار بودند'' شمالی ہند میں اصلاح سخن کی

روایت حقیقی معنوں میں شاہ حاتم کے ہاتھوں مستحکم ہوئی۔ شاہ حاتم کے معروف تلامذہ، سودا، رنگین، تاباں، بیدار، نثار وغیرہ اہم نام ہیں۔ اُن کی روایت سودا، شاہ نصیر، ذوق سے ہوتی ہوئی فصیح الملک داغ دہلوی اور اُن کے تلامذہ تک پہنچ جاتی ہے۔ داغ کی روایت کو احسان ماہروی، سیماب اکبرآبادی، نوح ناروی وغیرہ نے صحیح معنوں میں فروغ دیا ہے۔ یہ روایت ابھی تک کسی نہ کسی صورت میں جاری وساری ہے۔

ریختے کے فن میں ہیں شاگرد حاتم کے بہت
پر توجہ دل کی ہے ہر آن تاباں کی طرف

(حاتم)

● اب یہ قدیم روایت ختم کیوں ہوگئی؟

□ روایت ختم نہیں ہو جاتی ہے۔ یہ آج بھی جاری وساری ہے۔ ناوک حمزہ پوری، علی احمد جلیلی، مظہر امام، کمال احمد صدیقی، مغنی تبسم وغیرہ اس روایت کو استحکام بخشتے ہیں۔ اس روایت کو زندہ رکھنے کیلئے عنوان چشتی کے کام کو فی زمانہ فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔

● کیا اصلاح سخن کی روایت کا انتقال اُردو شاعری کا زوال ہے؟

□ یہ روایت ہنوز بالواسطہ یا بلاواسطہ دائم وقائم ہے۔ روایت کبھی ختم نہیں ہوتی۔ البتہ کمزور ضرور پڑتی ہے۔ زوال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا ہے

● کیا اُردو غزل، اس روایت کے انتقال سے ختم ہوگئی ہے؟

□ "بے اُستادا" رہنے کے باوجود کچھ شعراء مثلاً ناسخ، غالب نے اُردو غزل کو نئے امکانات سے آشنا کر دیا ہے اور اس کے دامن کو وسیع سے وسیع تر کر دیا ہے۔

● کیا آزاد، نثری اور بغیر اوزان ہیئتوں کا اپنا مستقبل ہے؟

□ آزاد اور نثری شاعری کا ہمارے یہاں قابل ذکر سرمایہ ہے اس لئے

مستقبل میں بھی ان ہیئتوں سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا ہے۔

- کیا اُن کی موجودگی نے بڑی اور امکانی شاعری کے آفاق تاریک کر دیئے ہیں؟

□ شاعری شاعری ہے بڑی اور امکانی شاعری کا میں قائل نہیں ہوں۔ تخلیقی اذہان کے ہوتے ہوئے یہ ناممکنات میں سے ہے۔

- اُردو مشاعروں کے زوال کے اسباب کیا ہیں؟

□ بے انتہا مصروفیت، ایک وقت میں کئی کام نباہنے کی دھن۔

- کیا اب کوئی تمثیلی مشاعرہ تحریر نہیں ہورہا ہے؟ وجہ؟

□ اس وقت بھی باضابطہ طور پر تحریر ہو رہے ہیں۔ رفعت سروشؔ آج بھی تمثیلی مشاعرے تحریر کر رہے ہیں۔

- کیا معاصر اُردو تنقید اپنے فرائض بغیر کسی تعصب کے ادا کر رہی ہے؟

□ نہیں! کیونکہ اس نے اپنا دائرۂ عمل محدود کر دیا ہے۔

- یونیورسٹیوں میں تحقیقی کاموں کی رفتار تیز ہے تاہم مکانیکی طرز کی تحقیق زیادہ ہو رہی ہے۔ شخصیت و کارنامے۔ ان میں بھی قینچی کی فنکاری زیادہ ہے کیا صحیح ہے؟

□ یہ رجحانات کم ہوگئے ہیں۔ اب میکانیت کی جگہ سائنٹفک اُصول تحقیق نے لے لی ہے۔

- آپ کے خیال میں تحقیقی کائنات کو مزید ہموار کرنے کیلئے وہ کونسے موضوعات ہیں جو ان چھوئے ہیں؟

□ اُردو زبان اور کلاسیکل ادب کا جدید علوم کی روشنی میں نتیجہ خیز مطالعہ

- کیا اب غالبؔ اور اقبالؔ پر کی جانے والی تحقیق نئی سمت تلاش کر رہی ہے؟

□ نہیں! ردّے پر ردّا چڑھایا جاتا ہے اور گنگا ملانے کی کوشش کی جا رہی

ہے۔

- کیا اب ان دو نابغہ تخلیق کاروں پر تحقیقی کام عارضی طور پر منقطع کر دینا چاہئے؟

□ نہیں! اُن کے اصل سرمائے کے پیش نظر اُن پر نئے سرے سے کام ہونا چاہئے نہ کہ اُن پر لکھی گئی سطحی تنقید کو مدنظر رکھ کر۔

- کیا ابھی میر، داغ، امیر، شاد عظیم آبادی، جوش، سیماب، آرزو لکھنوی وغیرہ پر کاموں کی رفتار تیز ہونی چاہئے؟

□ اُردو ادب کی تاریخ اتنی مختصر نہیں ہے اور لوگ بھی توجہ کے مستحق ہیں مثلاً بابائے اُردو مولوی عبد الحق، شیخ چاند، رتن ناتھ سرشار، ڈپٹی نذیر احمد، سودا، رنگین، باقی، ناصر کاظمی، خلیل الرحمٰن اعظمی وغیرہ اُردو کی ادبی تاریخ کے اتنے گوشے ہیں جن کو سمیٹنا مشکل ہے۔

- وہ کون سے موضوعات ہیں جن پر تحقیقی کام ہونا چاہئے؟

□ جن سے ہمارے کلاسیکی ادب کی بازیافت ہو جائے اور جدید ادب کے رجحانات منصۂ شہود پر آ جائیں گے۔

- کیا ابھی باکمال لوگوں پر کوئی ڈھنگ کا تحقیقی کام ہوا ہے؟

□ بہت حد تک، پھر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے چند مثالیں پیش کرتا ہوں (۱) پروفیسر مغنی تبسم کا فانی بدایونی پر (۲) خلیل الرحمٰن اعظمی کا آتش پر مقدمہ کلام آتش (۳) عابد پشاوری کا انشاء اللہ خان انشاء پر (۴) شبہ الحسن کا ناسخ پر

- آپ نے زندگی کو کیا سمجھا؟

□ زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں (ناسخ)

- موت کا خیال آپ کی روح میں کیسا رنگ بھرتا ہے؟

□ دراضطراب از شب تارم ستارہاست
یادرمیانِ سوختہ کاغذشرارہاست

● آپ کے مستقبل کے ادبی خواب کیا ہیں؟

□ کلاسیکی ادب کی تدوین، جدید تر شعری رجحانات کی تشہیر، نئی نسل کے لکھنے والوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا۔

●□●

مشاہیر کے فلک رنگ تاثرات

(۱) پروفیسر ظہیر احمد صدیقی

فرید پربتی کی شاعری اظہارِ ذات کی شاعری ہے۔ اُن کی غزلیں اور رباعیاں اپنے مخصوص لہجے اور منفرد اسلوب کی وجہ سے دور سے پہچانی جاسکتی ہیں۔ فرید پربتی کا تعلق اگر چہ جدید تر نسل سے ہے مگر اُن کو اردو کی کلاسیکی شاعری کا عرفان حاصل ہے جسکی وجہ سے اُن کی شاعری میں قدیم و جدید کا ایک خوبصورت امتزاج پیدا ہوگیا ہے۔ میں یہ بات بلاخوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ اُن کی شاعری مسرت سے شروع ہوتی ہے اور بصیرت پر ختم ہوجاتی ہے۔

(۲) پروفیسر شمیم حنفی

فرید پربتی کے اندر، نظم ونثر کی صلاحیتیں غیر معمولی ہیں۔ یہ بات قابل قدر ہے کہ فرید مشکل اصناف اور علمی وادبی مشاغل سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔

(۳) بلراج کومل

فرید پربتی کا مزاج کلاسیکی اور تہذیبی عناصر سے متاثر ہے۔ زبان کے استعمال میں بھی آپ بڑے نظم وضبط سے کام لیتے ہیں۔ آپ کی ردیفیں اور قافیے انتہائی متکلم ہیں، غزل کے عمومی لب و لہجے میں استعاراتی امکانات تلاش کرنے

کے علاوہ کہیں کہیں ٹھوس تفصیل سے بخوبی کام لیا ہے۔ فرؔید کی غزلوں کا انسان حساس اور دردمند ہے اور عصری انسان اور بنیادی انسان کی روحانی کشاکش پر بار بار نظر ڈالتا ہے اور خود جذباتی اور ذہنی کرب کے مراحل سے گزرتا ہے۔ بحروں کے انتخاب میں بھی تنوع پایا جاتا ہے۔

(۴) پروفیسر محمد انور الدین

رباعی اصنافِ سخن میں سب سے مشکل مانی جاتی ہے۔ اختصار نظام قوافی اور بحروں کی پابندی ان سب دشواریوں پر قابو پا کر ہی رباعی کہی جاسکتی ہے۔ اس کیلئے مناسبت طبع اور مہارتِ سخن لازمی ہے، دورِ حاضر میں رباعی کا چلن کم سے کمتر ہوتا جارہا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر فرؔید پربتی نے اس مشکل صنف کو اپنے تخلیقی اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ وہ مسلسل رباعیاں کہہ رہے ہیں ''فرید نامہ'' ان کی رباعیات کا مجموعہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ نئی نسل کے شاعروں میں فرؔید پربتی کلاسیکی روایات کے تحفظ اور تسلسل کے علمبردار ہیں۔ اُن کی رباعیوں میں حسنِ بیان بھی ہے اور فہم وفراست پر مبنی بصیرت افروز نکات بھی۔ کلاسیکی روایات کی پاسداری کے باوجود فرؔید پربتی کے ہاں فکر واحساس کی ندرت اور اظہار کی تازگی پائی جاتی ہے۔ پیش نظر مجموعہ معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ صوری خوبیوں کے اعتبار سے بھی لاجواب ہے۔ دیدہ زیب سرورق روشن کتابت، عمدہ طباعت اور نفیس کاغذ پر مشتمل یہ مجموعہ فردوسی نظر کا منظر پیش کرتا ہے۔

(۵) ساحل احمد

فرؔید پربتی جواں سال منفرد طرز فکر کے شاعر ہیں۔ ''اثبات''، ''ابرتر'' اور ''آبِ نیساں'' کے بعد کا وہ منفرد مجموعہ ہے جس میں نئے امکان وعوامل کا مثبت امتزاج موجود ہے۔ بادِ صبا، تتلی کلی، غنچہ سمن، رنگ چمن شعر ایک ایک کر جائیں گے

رم۔ اللہ بس۔ باقی ہوس

بعض اچھی رباعیوں کے ساتھ غزلوں کے کچھ اشعار نئے رنگ و آہنگ کا احساس دلاتے ہیں۔ رباعی کی فکری جودت تک رسائی پالینا ہنرمندی کے مصداق ہے یہ بہت مشکل فن ہے بطور فیشن کے جو رباعیاں ادھر کثرت سے کہی جانے لگی ہیں۔ بیشتر فنی استدراک وصراحت سے علاقہ نہیں رکھتیں یہی نہیں یک رنگ بھی ہیں اور چند مروجہ اوزان تک ہی محدود ہیں۔ یکسانیت کا یہ پہلو تھم جائے یارک جائے ''رباعی'' کا لباس کھل اٹھے۔ وہ شعراء لائق مبارکباد ہیں جنہوں نے رباعی کی ہیئت واصالت کا لحاظ رکھا ہے توقع ہے کہ فرید پربتی رباعی کی اس اندیکھی یالامحسوسی کیفیات کو تخلیقیت کی رقم سے اپنے فکرواحساس کا قصہ بنا کر شرفِ حصولی کو بوسہ دیں گے۔

پروانہ صفت آتش طور میں جل\
خاک رہ جاناں کو منہ پر مل\
گر عشق عناں گیر نہ ہو کیف حیات\
کچھ بھی نہیں دیتا ہے جز انداز خلل

(۶) افتخار امام صدیقی

رباعی۔ ایک مشکل فن ہے اس میں تخلیقی اظہار، ہما شما کے بس کی بات نہیں فارسی میں رباعی گو شعراء خاصی تعداد میں اہم ہوئے ہیں لیکن اردو میں تو انگلیوں پر گنے جانے والے مشاہیر شعراء ہیں۔ جبکہ آج نظم کی متعدد اصناف کا تنوع بکھرا ہوا ہے کہ معمولی معمولی قلم مزدور انہیں اپنا کر ''شاعر اعظم'' کہلانے پر اصرار کرتے ہیں کہیں اولیت کا زعم ہے تو کہیں پہلی کتاب شائع کروالینے کا دعویٰ۔ رباعی تو گویا مرہی گئی بالکل پابند نظم کی طرح۔ نوجوان شاعر فرید پربتی جو اپنی ذہانت کے مظاہر میں ایک مدت سے شاعری کے رسیا اور شاعری کے ناقدین کو اپنی طرف متوجہ کئے ہوئے ہیں،

رباعی کو اظہار کا وسیلہ کر لینے کے بعد غزل و نظم، دونوں ہی کی خصوصیات کو سموتے ہوئے، اسے تمام تر فنی اصولوں کے تناظر میں شاعری بناتے رہے ہیں اور اب ایک مجموعہ جو کہ مثالی بھی ہے اور دیدہ زیب بھی، شائع کیا ہے۔

(۷) شاہ رشاد عثمانی

تمام اصناف شاعری میں رباعی گوئی کو میں سب سے مشکل صنف مانتا ہوں۔ یہ دریا کو کوزہ میں بند کرنے یا چاول پہ قل اللہ لکھنے کا فن ہے اور یہ کمالِ فن، کل ہمارے امجد حیدر آبادی کے ہاتھ میں تھا تو آج فرید پربتی (کاشمیری) کی دسترس میں ہے۔ آپ کی رباعیات پر بڑا اچھا تبصرہ برادرم حقانی القاسمی نے کیا ہے میں ان کے حرف حرف سے متفق ہوں۔ آپ کے کلام میں تصوف کی چاشنی، پند و نصائح اور اخلاقی مضامین کی فراوانی کبھی فریدالدین عطار تو کبھی سعدی، کبھی رومی کی یاد دلاتی ہے اور اس معاملہ میں آپ میرے ہم مسلک اور ہم مشرب نظر آتے ہیں، سرمد کا میں بھی قائل ہوں اور آپ کی نظم مزار سرمد پر پڑھنی چاہتا ہوں جس کا ذکر قاسمی نے تفصیل سے کیا ہے۔ کبھی ممکن ہو تو اس کی فوٹو کاپی بھجوایئے۔

(۸) مظہر امام

فرید پربتی ریاست جموں و کشمیر کے ایک نوجوان شاعر ہیں، ان کی شاعری میں زندگی کی ناآسودگی اور حال و مستقبل کی بے یقینی کا شخصی اظہار ہوا ہے وہ اپنے تجربے کی لرزیدہ دستک سے قاری کے دل میں داخل ہونے اور اس میں ہیجانی کیفیت پیدا کرنے کی سعی کرتے ہیں ان کا ذہنی اور احساسی رویہ عصری صورتحال کا پروردہ ہے۔

ابھی سے فرید کے یہاں بھیڑ سے الگ ہونے کی خواہش موج زن ہے۔ پٹی ہوئی لفظیات کا سہارا لینے کی بجائے وہ ایسی لفظیات کی تلاش کرتے

ہیں، جس میں ان کے بطون کی آواز سما سکتی ہے۔ یہ لہجہ کھردار سہی، لیکن غیر حقیقی نہیں ہے۔ اپنی آواز کا ڑھنے کیلئے شاعر کو غیر معمولی دریافت کرنی پڑتی ہے۔ اس سخت کوش مرحلے سے اگر فرید پربتی سلامت روی سے گزر گئے تو یقیناً وہ اس منزل کو پالیں گے جس پر ان کی نظر ہے۔

(۹) پریم کمار نظر

فرید پربتی کی عمر اور اُٹھان دیکھ کر یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ فرید ریاست جموں و کشمیر کے جدید تر شعراء کی نسل کے 'میر کاروں' ہیں، اُن کی پیاری پیاری بھولی بھالی شخصیت کی طرح اُن کا کلام بھی پاک وصاف ہے۔

(۱۰) اسعد بدایونی

فرید پربتی کی غزلوں میں جیانِ حیرت وامکان کی خواب گوئی بھی ہے اور عصری حسیت بھی۔ وہ اُردو کی ادبی روایت سے بھی مکمل آگاہی رکھتے ہیں۔ ان کے شعری مجموعے ''آب نیساں'' میں چند نظمیں اور کچھ رباعیات بھی شامل ہیں مگر انکے شاعرانہ جوہر غزلوں ہی میں نمایاں ہوئے ہیں۔ میں انکی غزلوں سے چند شعر پیش کررہا ہوں تا کہ فرید پربتی کی ذہنی جودت اور فکری بصیرت کا اندازہ ہوسکے۔

وقت کے ساتھ چلتا ہوں　　پاؤں کی بیڑیاں بدلتا ہوں
زمیں پہ چاندستارے بکھیرنے والا　　نہ جانے کیوں میرے گھر کا دیا بجھا کے گیا
آشنائی کا صلہ عیار سے کیا مانگتا　　سائباں ٹوٹی ہوئی دیوار سے کیا مانگتا

(۱۱) کرشن کمار طورؔ

ڈاکٹر فرید پربتی کی رباعیاں ذہن کی اطرافی عبارت اور جودت سے نہ صرف معمور ہیں بلکہ ان میں خلاقی کی وہ تیزی، توانائی اور تندی بہ صراحت موجود

ہے جو کسی فن پارہ کو تیز فہم اور زیرک احتیاط سے صیقل کرتی ہے۔ ان کا بیان دانش ورانہ واقعیت پسندی سے مملو ہے اور یہی ان کی رباعیوں کی عقلیت سے معمور شعری خلق کی پہچان ہے۔

(۱۲) نور شاہ

جدید تر نسل کے جن اُردو شعراء نے غزل کے جسم سے بوسیدہ لباس کو اُتار پھینکا ہے اور جن کے ہاں نئی فکر، نئی سوچ، نئے شعور اور نئے تیور نظر آتے ہیں ان میں ڈاکٹر فرید پربتی کا نام بھی شامل ہے اور اہمیت کا حامل ہے۔ اُن کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں اور ادبی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ''گفتگو چاند سے'' اُن کی نئی شعری تخلیق ہے اور غزلوں پر مشتمل ہے غزل کی اپنی ایک انفرادی اور مخصوص تہذیب ہے اور اس تہذیب کے دائرے میں ڈاکٹر فرید پربتی کی غزلیں خیال، کیفیت، موضوع اور لب ولہجہ کے پس منظر میں بے پناہ معنویت رکھتی ہے، اُن کی غزلیں پڑھ کر تھکان کا احساس نہیں ہوتا بلکہ ذہن کی راہیں کھل کر اور بھی روشن ہو جاتی ہیں۔ ان غزلوں میں نئے پن اور سادگی کی گلابی مہک ہے سنجیدگی اور شائستگی ہے، ذکر محبت کے ساتھ ساتھ ذکر کائنات بھی ہے اُن کے اپنے مشاہدات، تجربات اور احساسات ہیں۔ تلخ سچائیوں کی عکاسی ہے اس لئے یہ غزلیں بے پناہ وسعت کی حامل ہیں، ان کا اسلوب اور لہجہ اس بات کی جانب ایک واضح اشارہ ہے کہ ڈاکٹر فرید پربتی فنی پختگی کی منزل سے بہت آگے نکل چکے ہیں............!!

(۱۳) پروفیسر بشیر احمد نحوی

نژادِ نو سے وابستہ کشمیر کے اردو شعراء میں فرید پربتی اپنی انفرادیت قائم کرتے ہوئے نئے شعری تجربوں کی جولانگاہ میں رواں دواں نظر آتے ہیں۔ وہ

شباب وشراب کی سخن طرازیوں سے بالاتر ہوکر اور ہٹ کر ذات، کائنات اور انسان کو درپیش مسائل سے وابستگی دِکھا کر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کرتے ہیں۔ان کی رباعیوں میں ایک منفرد رنگ اور مترنم آہنگ نظر آتا ہے۔

بحیثیت ایک رفیق کار کے فرید پربتی میں دوستی، ایثار اور وفا کے جملہ اوصاف موجود ہیں۔ وہ کٹھن مرحلوں میں دوستی کا حق نبھانے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ وہ بقامت اور بہ قیمت دونوں حیثیتوں میں بہتر ہیں اور ہر وقت عالی ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

(۱۴) جان محمد آزاد

فرید پربتی لفظ شناس شاعر ہیں اور اپنے الفاظ اس انداز سے ترتیب دیتے ہیں یا پھر الفاظ خود ہی سجے سجائے چلے آتے ہیں کہ انکے شعری کردار کی عبارت واشارت کے گرد روشنی کا ایک ہار سا بن جاتا ہے اور اشعار سے ایک ملکوتی سی فضا پیدا ہوتی ہے۔ یہ رجحان فرید کی تخلیقی تعمیر کی واضح حیثیت بھی متعین کرتی ہے اور اس بات کا بھی عندیہ دیتی ہے کہ انکشاف ذات کے وسیلے سے ابھی آپ کے سامنے نئے آسمان پرواز کی سرسراہٹوں کے منتظر ہیں۔

●□●

مشاہیر
کے
خطوط

فریؔد پربتی کے نام

١

حیدرآباد

١٩ فروری ١٩٩٣ء

مکرمی جناب فرید پربتی صاحب سلام مسنون

ایک مدتِ دراز کے بعد آپ کی تحریر دیکھنے میں آئی۔ خیرت سے، مصروفیت سے اور حالات سے آگاہی ہوئی۔ آپ نے اپنے یہاں کی تباہی کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کو پڑھ کر آنکھیں بھر آئیں۔ اب تو یہی سب کچھ کم و بیش برصغیر کے ہر مقام پر ہو رہا ہے کس کس مقام کا ماتم کیا جائے؟

اس عرصہ میں آپ نے جو ادبی ولسانی فتوحات حاصل کی ہیں ان کی مبارکباد دیتا ہوں۔ اپنے وطن سے باہر رہ کر آپ کو کئی مقامات پر جانے اور وہاں کی ادبی فضا میں وقت گزارنے کا جو موقع ملا وہ یقیناً حاصلِ زندگی ہیں اور آپ کے ادبی سفر کو جاری رکھنے میں مد و معاون ہوں گے۔ یہاں وہاں آپ نے میرا ذکر بھی سنا یہ بات میرے لئے باعث مسرت ہیں۔ یہ اللہ کا کرم ہے۔ بیدار صاحب سے حیدرآباد میں ملاقات ہوئی تھی جو ایک سمینار کے سلسلے میں آئے تھے۔ اب بھی خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہے۔

آپ کی جو کتابیں زیر طبع ہیں ان کی اشاعت کا بے چینی سے انتظار ہے۔ چھپتے ہی مجھے ضرور بھیجیں۔ مرسلہ غزلیں میں نے بغور دیکھ لیں۔ اشعار درست و چست ہیں۔

اس درمیان میں نے والد مرحوم حضرت جلیل مانکپوری کی حیات اور فکر و فن پر ایک مقالہ تحریر کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر لی۔ درحقیقت میرے

پیش نظر سوانح حیات کی ترتیب تھی سو وہ کام ہو گیا اور اضافی طور پر ڈگری بھی مل گئی۔ یہ کتاب اشاعت کے مرحلوں میں ہے۔ انشاء اللہ ایک آدھ ماہ میں چھپ کر منظر عام پر آجائے گی۔

میں نے حالات حاضرہ کے پس منظر پر ایک غزل کہی تھی جسے بہت سراہا گیا اس کی نقل بھیج رہا ہوں۔ امید کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ اور خط و کتابت کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

علی احمد جلیلی

۲

حیدر آباد

جناب فرید پربتی صاحب   سلام مسنون

مکتوب ملا۔ آپ کا علی گڑھ جانا معلوم ہوا۔ کشمیر کے حالات سے بھی آگاہی ہوئی۔

میری کتاب جو حضرت جلیلؔ کی سوانح حیات ہے اپریل کے ختم تک انشاء اللہ منظر عام پر آجائے گی۔ جہاں تک ان کے دواوین کا تعلق ہے میں نے تینوں دواوین سے تقریباً تین سو غزلوں کا انتخاب کر کے اسے "کائناتِ جلیل" کے عنوان سے ترتیب دیا تھا۔ یہ مجموعہ کلام ترقی اردو بیورو دہلی سے شائع ہو چکا ہے اور وہیں سے دستیاب ہو سکتا ہے۔

آپ کی غزلیں میں نے بغور دیکھ لیں۔ واپس کرتا ہوں۔ آپ نے دو اصلاح شدہ شعروں کی وضاحت چاہی ہے۔

یہ خیال درست نہیں کہ تکرار سے شعر کی فصاحت میں کمی واقع ہوتی ہے تکرار تو صنایع بدایع کی ایک صورت ہیں جس سے شعر کے آہنگ میں اضافہ ہوتا ہے۔

”دیا جو تو نے وہ لوٹا دیا سبھی میں نے“

اس میں ”دیا“ کی تکرار سے ایک خاص قسم کا آہنگ پیدا ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ آپ کے مصرع میں روانی نہ تھی۔ میں نے اسے رواں کر دیا ہے۔

دوسرے شعر میں لفظ شغل کا جو مفہوم آپ کے ذہن میں ہے وہ کھل کر سامنے نہیں آتا۔ شغل کا لفظ غزل کے علائم میں سے بھی نہیں لغوی معنی رکھتا ہے البتہ مسائل اس دور کی مسائلی شاعری میں غزل کے علائم میں سے ایک ہے جو وسیع معنوں میں استعمال ہو رہا ہے۔

میری مرسلہ غزل آپ کو پسند آئی شکریہ۔ شیرازہ میں میری غزلیں شائع ہوئی تھیں لیکن آپ یہ سلسلہ جاری رکھیں۔

علی احمد جلیلی

۳

حیدر آباد

۲۶/جون ۱۹۹۷ء

محبی فرید پرب‍تی صاحب   سلام مسنون

ایک عرصہ کے بعد آپ کا خط ملا۔ خیریت معلوم ہو کر اور یہ جان کر اطمینان ہوا کہ میرا شعری مجموعہ ”لہو کی آنچ“ آپ کو پہنچ چکا ہے۔

آپ اپنے نجی حالات و واقعات کے بارے میں مجھے پہلے بھی لکھ چکے ہیں میں اس پس منظر سے واقف ہوں۔ خدا کرے کہ ان نامساعد حالات سے آپ کو جلد فراغ حاصل ہو جائے۔

میں نے اپنا یہ شعری مجموعہ ہندوستان کے بہت سارے دانشوروں کو اس بے نیازی کے ساتھ بھیج دیا ہے کہ وہ تبصرہ کریں یا نہ کریں۔ میرا مقصد یہ ہوتا ہے کہ میری فکر ان تک پہنچ جائے۔ اکثر نے بہت اچھے لفظ میں اپنی پسندیدگی کا اظہار

کیا ہے۔

یہ خوشخبری میرے لئے بڑی مسرت کا باعث ہوئی کہ کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں آپ کا تقرر ہو چکا ہے۔ میری طرف سے مبارکباد۔

یہ خبر بھی بڑی خوش آیند ہے کہ ابکی سردیوں میں آپ حیدرآباد آنے کا قصد کر رہے ہیں۔ میں چشم براہ ہوں۔

امید کہ آپ بخیرت ہوں۔

علی احمد جلیلی

۴

حیدرآباد

۳۰ فروری ۱۹۹۸ء

محبی فرید پربتی صاحب سلام مسنون

بہت دنوں بعد آپ کا خط آیا۔ خیریت معلوم ہو کر خوشی ہوئی۔ یہ بات میرے لئے بہت باعث مسرت ہوگی اگر آپ حیدرآباد کا ارادہ کریں گے۔ خدا کرے جلد آپ کا یہ ارادہ پورا ہو۔ مجھے بھی آپ سے ملنے کا اشتیاق ہے۔

آپ کی مرسلہ غزلیں دیکھ لیں۔ اشعار درست و چست ہیں۔ ایک دو مقامات پر کچھ تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ وضاحت میں نے کر دی ہے دو فارسی الفاظ کے درمیان واو عطف کو ملا کر موزوں کرنا چاہئے۔ نار جہنم اس بحر میں موزوں نہیں ہوتا۔ جہنم کا وزن فعولی ہے۔

میری ایک کتاب تنقیدی مضامین کی حال ہی میں شائع ہوئی ہے اس کے دو نسخے بھیجتا ہوں۔ شیرازہ میں اس پر تبصرہ ہونا چاہئے۔

علی احمد جلیلی

۵

حیدرآباد

۲۸؍فروری ۱۹۹۸ء

جناب فرید پربتی صاحب   سلام مسنون

آپ کی کتاب "اثبات" ملی۔ بڑے اہتمام اور بڑے خوبصورت گٹ اپ کے ساتھ شائع ہوئی ہے شمس الرحمٰن فاروقی اور دیگر ایک قسم کی تحریریں اس کا وقار بڑھاتی ہیں۔

آپ کی رباعیات پہلی مرتبہ میری نظر سے گزریں۔ رباعیاں پسند آئیں۔ رباعی کے فن کو زندہ رکھنے کی پرخلوص کوشش ہے آج کی نسل تو رباعی کو اس کے صحیح وزن کے ساتھ پڑھ بھی نہیں سکتی۔ غزلوں اور تضمین کی شمولیت اس مجموعہ کے چارم میں اضافہ کرتی ہیں۔ آپ چونکہ مجھ سے مشورہ سخن کرتے ہیں اس لئے چند باتوں کی طرف توجہ دلاتا ہوں جس کا مقصد اصلاحی ہے۔

ابتدا میں صارقین کی ایک رباعی درج ہے۔ فنی نقطہ نظر سے اس رباعی میں نقص یہ ہے کہ اس کے قوافی، طالب، غالب میں صائب کو شامل کردیا ہے جو بے جوڑ ہوگیا ہے۔ صفحہ ۵۱ پر آپ نے اپنی رباعی میں غالب، طالب اور قالب کے قوافی درست رکھے ہیں۔

رباعی میں تین قافیہ ہوتے ہیں جن پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ بے ربطی آجاتی ہے۔ آپ کی کچھ رباعیوں میں ایسی بے ربطی آگئی ہے جو فن قافیہ کے نقطہ نظر سے درست نہیں قرار پائی۔ میں اس لئے ان کی نشاندہی کر رہا ہوں تاکہ آپ اس نقص سے باخبر رہیں۔

۱. رباعی صفحہ ۲۹   قوافی   زُور، طَور، دَور

زبر کے قافیوں کے ساتھ پیش کا قافیہ درست نہیں

۲. رباعی صفحہ ۳۵   قوافی، اڑنا، بڑھنا، لڑنا

اُڑنا اور لڑنا کیساتھ بڑھنا کا قافیہ درست نہیں

۳. رباعی ص ۳۵ قوافی مناروں، کواڑوں، دراڑوں

کواڑوں اور دراڑوں میں ڑ کے ساتھ ر کا قافیہ نہیں ملایا جاسکتا

۴. رباعی صفحہ ۴۸ قوافی حیرت، صداقت، کدورت

حیرت اور کدورت دونوں میں "ر" ہے ان کیساتھ صداقت کو شامل نہیں کیا جاسکتا۔

۵. رباعی صفحہ ۶۱ قوافی بھٹکتا، جیتا، ٹھہرا

اس میں تین گروپ کے قوافی کو یکجا کیا گیا ہے۔ بھٹکنا، کا قافیہ کھٹکنا ہوگا جیتا کا قافیہ پیتا، سیتا ہوگا، ٹھہرا کا گروپ ہے گہرا، بہرا وغیرہ

۶. رباعی صفحہ ۶۳ قوافی رہتی، بنالیتی، پڑتی

تین مختلف گروپ کے قافیے یکجا ہو گئے ہیں۔ رباعی میں اگر رہتی کو رکھا جائے تو اسکے ساتھ بہتی سہتی کو شامل کرنا ہوگا۔ بنالیتی کے قوافی ہوں گے ملالیتی، سنالیتی وغیرہ پڑتی کے قوافی لڑتی، بگڑتی وغیرہ ہیں۔

۷. رباعی صفحہ ۶۲ میں دو قوافی نگاہ اور پگاہ ہیں تو تیسرے قافیہ میں بھی گ کی قید لازمی ہوگی۔

۸. رباعی صفحہ ۵۰ باہر اور کر زبر کے قافیے ہیں ان کے ساتھ خاطر یعنی زیر کا قافیہ بے جوڑ ہو جاتا ہے۔

۹. رباعی صفحہ ۶۵ میں تمکین، رنگین اور تسکین تینوں یکجا نہیں ہو سکتے۔

۱۰. رباعی صفحہ ۸۹ میں سوج اور نوج زبر کے قوافی کے ساتھ کھوج کی شمولیت ممکن نہیں۔

آپ نے مجموعہ کے حسن و قبح کے تعلق سے آگہی کی بات لکھی تھی اس لئے فنی طور پر جو اعتراض ہوسکتا ہے اس کی وضاحت کردی ہے۔

میری کتاب "نقد و نگاہ" پر شیرازہ میں تبصرہ ہو جائے تو بہتر ہوگا۔ جب بھی

ہو مجھے اس کی ایک کاپی ضرور بھیجیں تا کہ میں اپنی کمزوریوں سے واقف ہوسکوں۔

علی احمد جلیلی

۶

حیدرآباد

۱۰ مارچ ۱۹۹۹ء

جنابِ فرید پربتی صاحب سلام مسنون

میری ایک کتاب "غالب ایک مطالعہ" جو ابھی شائع ہوئی ہے۔ آپ کیلئے بھیج رہا ہوں۔

ایک عرصہ سے آپ کی خیریت معلوم نہیں ہوئی۔ وہاں کے کیا حالات ہیں اپنی خیرت اور رسید سے اطلاع دیجئے۔

علی احمد جلیلی

۷

حیدرآباد

۱۵ر مئی ۱۹۹۹ء

محبی فرید پربتی صاحب سلام مسنون

شیرازہ کے ساتھ آپ کا خط بہت دنوں بعد ملا اور خیریت معلوم ہوئی۔ والد کے سانحہ ارتحال پر آپ کے کرب کا میں اندازہ لگا سکتا ہوں۔ خدا انہیں غرقِ رحمت کرے۔

میری کتاب پسند آئی۔ معلوم ہو کر خوشی ہوئی۔ غالبؔ کے جن پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا گیا تھا میں نے ان کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں تعریفی خطوط مجھے ملے ہیں۔

آپ کی تخلیقات یہاں وہاں رسالوں میں پڑھنے کو ملتی رہتی ہیں۔شیرازہ میں میری جو غزلیں چھپی ہیں اس کی اطلاع مجھے کچھ احباب کے خطوط سے پہلے ہی مل چکی تھی۔ میں نے تبصرہ کیلئے اپنی کتاب شیرازہ کو بھیج دی ہے۔

باقی خیریت۔

علی احمد جلیلی

۸

حیدرآباد

۲۵ستمبر۲۰۰۰ء

محبی فرید پربتی صاحب سلام مسنون

حیدرآباد میں آپ سے مختصر ملاقات رہی مگر اس کی یاد بہت دنوں تک آتی رہے گی۔

اس درمیان میری طبیعت کچھ ناساز ہوگئی تھی۔اب بفضلہٖ ٹھیک ہوں آپ کے انٹرویو کا کیا ہوا۔ کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ میں نے پروفیسر انورالدین کو فون کیا تھا مگر انہوں نے کوئی صاف جواب نہیں دیا۔

میں نے اپنی عروض کی کتاب کا نسخہ بڑی مشکل سے فراہم کیا ہے بھیجتا ہوں۔

آپ نے عروض پر اپنے ایک مضمون کا ذکر کیا تھا کیا وہ مضمون کہیں چھپ گیا ہے۔

آپ نے چند تازہ غزلوں کی فرمائش کی تھی بھیج رہا ہوں۔ کچھ دنوں پہلے کشمیر سے تعمیر کا پرچہ آیا ہے۔اس میں میری ایک غزل چھپی ہے جو پہلے شیرازہ میں بھی چھپ چکی ہے۔انہیں میں ایک مضمون بھیج رہا ہوں۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

علی احمد جلیلی

(۹)

حیدرآباد

۳۱/اگست ۲۰۰۱ء

مکرمی ڈاکٹر فرید پربتی صاحب　　　سلام مسنون

بہت دنوں کے بعد آج آپ کا خط ملا۔ خیریت معلوم ہونے کے ساتھ ساتھ یہ خوشخبری بھی ملی کہ آپ کا تقرر باضابطہ طور پر شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی میں ہوگیا ہے۔ میری طرف سے مبارکباد۔

اس سے قبل جو کتابیں میں نے بھیجی تھی ان کی رسید اب ملی۔ اس خط کے ساتھ اپنے نعتیہ کلام کا مجموعہ بھیج رہا ہوں۔

باقی خیریت، امید ہے کہ درست کارسلسلہ جاری رہے گا۔

علی احمد جلیلی

(۱۰)

حیدرآباد

۲/نومبر ۲۰۰۱ء

مکرمی جناب فرید پربتی صاحب　　　سلام مسنون

خط ملا۔ خیریت معلوم ہونے پر خوشی ہوئی۔ یونیورسٹی سنڈیکیٹ کی طرف سے جو انتخاب ہوا ہے اس کا کریڈٹ آپ کو ملنا ہی چاہئے تھا۔

حیدرآباد میں اب سیاست ادب پر غالب ہے سال گزشتہ مخدوم ایوارڈ شاعری کا جو مجھ کو ملنا چاہئے تھا ایک منشی کاتب کو دیا گیا۔ باہر کے لوگوں کیلئے تو یہاں کی فضا اور بھی ناخوشگوار ہے۔

بازیافت کا شمارہ مجھے وصول ہوا ہے اس کا معیار اور گٹ اَپ مجھے پسند آیا۔

میں کوئی مضمون اس کیلئے بھیجوں گا۔

فن تاریخ سے متعلق ایک جامع کتاب لاہور کے غلام حسن کسریٰ نے لکھی ہے جن کا تعلق نقوش لاہور سے رہا ہے۔ اگر آپ کے کوئی شناسا لاہور میں ہوں تو وہ ادارہ نقوش سے ربط پیدا کر کے اسے حاصل کر سکتے ہیں۔

آپ کی غزلیں بغور دیکھ لیں آپ کی فکر میں انفرادیت ہے۔ یہ اور بھی نکھر سکتی ہے جبکہ ترسیل عام قاری کیلئے بھی واضح ہو۔ والد مرحوم کے قصائد آپ کو پسند آئے بسبب یہ ہے کہ انہوں نے کلاسیکی عقائد کی بلاغت کو فصاحت میں بدل دیا ہے۔

یہاں کی اردو اکیڈمی نے میری کتاب اردو تلفظ لغت کو اپنی مطبوعات کے زمرہ میں شامل کر کے چھوپایا ہے۔ یہ میری انفرادی کوشش ہے آپ کو پسند آئے گی۔

باقی خیریت

علی احمد جلیلی

۱۱

حیدر آباد

۲۵ر دسمبر ۲۰۰۱ء

مکرمی جناب فرید پربتی صاحب سلام مسنون

آپ کا خط آیا جس میں آپ نے لکھا ہے کہ پاکستان سے غلام حسن کسریٰ کی تاریخ گوئی سے متعلق کتاب حاصل کرنا مشکل ہے کسریٰ صاحب کی کتاب جو میرے پاس تھی وہ میرے احباب اٹھا گئے ورنہ میں وہی کتاب آپ کو بھیج دیتا۔

اس سلسلے میں تاریخ گوئی پر ایک اور مستند کتاب عزیز جنگ ولا کی ہے جس کا نام غرائب الجمل ہے اس کتاب کو ڈاکٹر حسن الدین احمد نے دوبارہ اپنے نوٹ کے ساتھ شائع کروایا ہے ان کا پتہ میں خود ان کے قلم کی تحریر کے ساتھ منسلک کر رہا ہوں۔ کتاب کی قیمت بھی اس میں درج ہے آپ ان کو اس کی قیمت ذریعہ منی آرڈر بھیج دیجئے اور

میرے حوالہ کا بھی ذکر کردیئے۔ وہ آپ کو بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ بھجوادیں گے۔ یہ کتاب غرائب الجمل تاریخ گوئی پر جامع کتاب ہے۔ غلام حسن کسریٰ مرحوم نے اس سے بھی استفادہ کیا ہے۔ آپ حسن الدین احمد صاحب سے کتاب طلب کرتے ہوئے اس کی اطلاع مجھے بھی دیدیں۔

اس درمیان میری طبیعت ناساز رہی اب بفضلہٖ ٹھیک ہوں امید کہ آپ بخیرت ہوں گے۔

شیرازہ کا تازہ شمارہ آیا ہے جو شاید ایک آپ کی ایما پر بھیجا گیا ہے۔ میں اس کیلئے اور آپ کے بازیافت دونوں کیلئے کچھ کچھ ضرور لکھ بھیجوں گا۔

علی احمد جلیلی

۱۲

حیدرآباد

مکرمی فرید پربتیؔ صاحب سلام مسنون

آپ کے خط کے جواب میں، جس میں آپ نے تاریخ گوئی کی کتاب کے بارے میں لکھا تھا کہ پاکستان سے اس کا حصول ممکن نہیں میں خط لکھ چکا ہوں۔

اس سلسلے میں میں نے لکھا تھا کہ تاریخ گوئی پر ایک مستند کتاب عزیز جنگ والا کی لکھی ہوئی ہے۔ جس سے غلام حسن کسریٰ منہاس صاحب نے بھی استفادہ کیا ہے۔ اس کے حصول کیلئے میں نے ایک پتہ بھی لکھ بھیجا تھا۔ اس قدیم تاریخی کتاب کو دہلی قومی کونسل نے دوبارہ شائع کیا ہے اپنی مطبوعات کے سلسلے میں میں پتہ درج کر رہا ہوں۔ آپ انہیں لکھیں تو وہ بذریعہ وی پی آپ کو بھیج دیں گے۔

میری طبیعت کچھ دنوں سے ناساز گار ہے لیکن اب معاملہ ٹھیک ہے۔

امید کہ آپ بخیر ہوں گے۔ کتاب کا نام غرائب الجمل اور مؤلف عزیز جنگ والا ہے۔

علی احمد جلیلی

۱۳

۴رفروری ۲۰۰۲ء

محبی ڈاکٹر فرید پربتی صاحب۔سلام مسنون

خط ملا۔غرائب الجمل آپ نے حاصل کرلی ہے تو اس سے آپ کو کافی مواد مل جائے گا۔''تاریخ گوئی کی روایت'' کے نام سے آپ جو کتاب لکھ رہے ہیں اور جو خاکہ آپ نے بنایا ہے اس سے اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔تمام اساتذۂ سخن کا احاطہ کرلیا ہے۔

میں نے بہت تاریخیں نکالی ہے لیکن افتادِ طبیعت کا یہ حال ہے کہ کسی کی نقل نہیں رکھی۔غلام حسن کسریٰ نے تاریخ گوئی پر جو کتاب لکھی ہے اس میں بھی میرا قطعہ تاریخ درج ہے۔محمد طفیل مرحوم مدیر ''نقوش'' کے وفات کی تاریخ بھی نکالی تھی جو نقوش کے طفیل نمبر میں درج ہے۔غلام حسن کسریٰ کے وفات کی تاریخ بھی نقوش میں چھپی ہے لیکن اب اس کی نقل ملنی بھی مشکل ہے۔ویسے اساتذہ کی تاریخوں کے ذکر میں اس کی ضرورت بھی نہیں۔آپ نے لکھا ہے کہ آپ کی کتاب میرے نام سے منسوب ہوگی اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔

غلام حسن کسریٰ کے ایک قطعہ تاریخ کی اصلاح جلیل مانک پوری نے یوں کی تھی۔

سفر کرداز عالمِ بے ثبات — صد افسوس آں نیک دل خوش سرشت
رقم سال رحلت شد ایں لاجواب — غلامِ سکینہ بباغ بہشت
۱۹۴۴ء

اصلاح

کنیز '' '' '' '' ''

اور لکھا تھا عورت کی تاریخ میں غلام کا لفظ اچھا نہیں۔کنیز ہونا چاہیے۔

چنانچہ اس میں غلام کی جگہ کنیز بنادیا گیا ہے اور اعداد کی وہی صورت ہے

جو آپ نے لکھی تھی۔
اگر یہ تاریخی اصلاح آپ کی نظر سے نہیں گزری تو اسے شامل کر لیں کیونکہ تاریخی مصرع میں الفاظ کی یہ تبدیلی اپنا جواب نہیں رکھتی۔
باقی خیریت

ڈاکٹر علی احمد جلیلی

۱۴

حیدرآباد
۱۰/نومبر ۲۰۰۳ء

مکرمی سلام مسنون

ایک عرصہ سے آپ کی کوئی تحریر نہیں ملی۔ میں نے اپنی کتاب ''اردو غزل پر ہندی کے اثرات'' بھجوائی تھی اور امید ہے کہ آپ اس پر تبصرہ کروا دیں۔
شیرازہ میں میرا مضمون غالب کی فاریست شائع ہوا ہے۔ معاوضہ کی رقم انہوں نے مجھے بھیج دی ہے۔ لیکن جس شمارہ میں وہ مضمون شائع ہوا ہے وہ مجھے نہیں ملا۔
آپ فنِ تاریخ گوئی پر کام کر رہے تھے کیا وہ کام ابھی تک جاری ہے؟
والدِ مرحوم حضرت جلیل مانک پوری کی تاریخیں آپ کو دستیاب ہوئی یا نہیں؟

علی احمد جلیلی

۱۵

حیدرآباد
۵/دسمبر ۲۰۰۳ء

مکرمی جناب فرید پربتی صاحب سلام مسنون

''فرید نامہ'' اپنی تمام آرائشوں، تابانیوں اور طباعت کی دل آویزوں کے

ساتھ وصول ہوا۔ لیکن انتساب پر نظر پڑتے ہی اس میں اپنا نام دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ آپ کی عقیدت ہے خلوص ہے اور کچھ ہے اس کے آگے سوچنے میں مجھے کوئی لفظ نہ ملا۔

آپ کی شاعری کی ابتداء بھی میرے سامنے ہے اور ارتقاء کا وہ سفر بھی جو بڑی تیز رفتاری کے ساتھ رواں دواں ہے۔ رباعی گوئی میں آپ کی شعری طریق اور تخلیقی اظہار میں جو انفرادیت ہے وہ آپ کی اپنی فکر کی ترجمان ہے۔

دیباچہ بہت جامع طور پر لکھا گیا ہے اس میں محرومؔ کا نام بھی شامل ہونا تھا۔

شیرازہ میں غالبؔ کی فارسی دانی پر جو مضمون میں نے لکھا تھا اس کا معاوضہ وصول ہوا ہے لیکن وہ شمارہ نہیں ملا جس میں میرا مضمون چھپا ہے۔

میری کتاب ''اردو غزل پر ہندی کے اثرات'' بھیجی جا چکی ہے۔ اس پر تبصرہ کا انتظار ہے۔ میری صحت اب زوال پذیر ہے تاہم خدا کا شکر ہے کہ لکھنے پڑھنے کا کام جاری ہے۔

امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

علی احمد جلیلی

۱۶

حیدر آباد

۵ جولائی ۲۰۰۴ء

جناب فرید پربتی صاحب سلام مسنون

ایک عرصہ سے آپ کی خیریت معلوم نہیں ہوئی۔ میں نے بھی اس درمیان کوئی خط نہیں لکھا۔

میرا ایک مضمون جو غالب کی فارسیت سے متعلق تھا شیرازہ میں چھپ چکا ہے۔ غالب ہی کے متعلق سے میں نے ایک اور مضمون لفظیات غالب (اعداد شمار کی روشنی میں) لکھا ہے جو بھیجتا ہوں۔ شیرازہ، بازیافت میں شائع کیا جاسکتا ہے جیسا آپ مناسب سمجھتیں آپ خود اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔

یہاں کے ایک شاعر رؤف خیرؔ جو سرینگر گئے تھے آپ کا ذکر کر رہے تھے۔ غالباً کسی مشاعرہ میں شرکت کی تھی۔

میری صحت اب پہلے جیسی نہیں رہی۔ طبیعت میں اُتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے تاہم بفضلہٖ لکھنے پڑھنے کا کام جاری رہتا ہے آپ اپنی خیرت سے مطلع کریں۔

علی احمد جلیلی

●□●

مدیر اعلیٰ 'شاعر' افتخار امام صدیقی

(۱)

بمبئی

۱۴ر ستمبر ۱۹۹۶ء

برادرم فرید پربتی

۲ر اگست کا خط موصول ہوا۔

آپ کا مقالہ: ''شمالی ہند کا پہلا صاحب دیوان شاعر''

شاعر میں شائع نہیں ہو سکے گا۔

مئی اور جون کے شماروں سے معلوم ہوا ہوگا کہ اب شاعر کے عام شمارے شائع نہیں ہوں گے۔

ہم عصر اردو ادب نمبر کی جلد اول اکتوبر کے آخر تک کئی ہزار صفحات اور تین جلدیں۔

تمام شماروں کی اشاعت کا سلسلہ جب بھی شروع ہوگا اس میں خاص نمبر سے بچا ہوا مواد شامل کیا جائے گا۔ باقی اللہ کو معلوم۔

عروض اور اصلاح سخن پر آپ کے پاس کیا مواد ہے؟ اصلاح سخن کی روایت پر ایک عمدہ سا مضمون لکھئے اور اسے ہم عصر شاعری تک لے آیئے۔

دستور الاصلاح کا تعارف خاص نمبر میں دے رہا ہوں اور میرؔ کے شاگرد خاکسار کے ایک شعر:

خاکسار! اس کی تو آنکھوں سے گھنے مت لگیو
مجھ کو ان خانہ خرابوں ہی نے بیمار کیا

پر میر سے آج تک کی اصلاحوں کا جائزہ بھی کیا آپ نے میر کی اصلاح اسی شعر پر دیکھی؟

آپ کا کیا خیال ہے؟

مخلص

افتخار امام صدیقی

پس نوشت

خط مکمل کر چکا تھا کہ کچھ اور باتیں ذہن میں آ گئیں۔

آپ نے شاعری میں کس سے اصلاح لی؟ وادی میں نئی شاعری کے ذیل میں کن لوگوں کے نام آتے ہیں؟ گذشتہ چند برسوں کے خراب صورتحال کے باوجود وادی میں شعر وادب تخلیق ہوا ہے۔ کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں۔ ان کتابوں کی فہرست درکار ہے۔ اس دوران کشمیر میں اردو افسانہ برائے نام ہی تخلیق ہوا یا اس کی رفتار تسلی بخش رہی ہے؟

شاعر کے خاص نمبر میں کشمیر سے کئی پرانے قلمکاروں کو شامل کیا ہے۔ پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ بہت اہم نام رہ نہ جائیں۔ کچھ اور تازہ کار نام بھی آئیں۔

۲

بمبئی

۱۵/اکتوبر ۹۶

برادرم فرید پربتی

آپ کا خط اور مضمون ''خاکسار کے ایک شعر پر میر کی اصلاح'' موصول ہوا۔ آپ نے بڑی محنت سے تمام لوگوں کو جمع کر کے اس پر خوب محاکمہ کیا ہے لیکن آپ نے بھی وہی بنیادی غلطی کی ہے جو ابر احسنی سے شمس الرحمٰن فاروقی تک تمام لوگوں نے سیماب اکبر آبادی کے سلسلے میں کی ہے۔ آپ نے دستور لااصلاح

نہیں دیکھی، ابر صاحب نے کتاب دیکھی ضرور لیکن اپنے استاد محترم کی اصلاحوں پر سیماب کی توجیحات سے ایسے چراغ پا ہوئے کہ نہایت ہی غیر سنجیدہ کتاب لکھ دی۔ خاکسار کے شعر کا اصل متن کیا ہے اور کیا نہیں اس سے قطع نظر سیماب نے دستور الاصلاح میں خاکسار کے شعر پر میر کی اصلاح کے ساتھ توجیہ میں اپنی رائے دینے کے بجائے لکھا کہ:

''بقول میر حسن......'' اور میر حسن کی رائے درج کر دی اب اگر غلط یا صحیح کی بحث ہوتی ہے تو تمام تر بحث میر تقی میر اور میر حسن کے حوالے سے ہونی چاہئے کیونکہ دستور الاصلاح سے پہلے مشاطہ سخن (۱۹۱۷ء) شائع ہو چکی تھی اور اس میں نکات الشعراء سے میر کی اصلاحوں کے ذیل میں خاکسار کا شعر اصلاح کے ساتھ درج تھا۔ خاکسار کے شعر پر میر کی اصلاح پر تمام تر مباحث سیماب کے کھاتے میں ڈال دیئے گئے اور کہنے والوں نے جو جی میں آیا کہتے چلے گئے۔

شاعر کے خاص نمبر میں دستور الاصلاح کا تعارف پیش کرتے ہوئے مذکورہ شعر کو زیر بحث لایا گیا ہے اور تمام مباحث سمیٹ لئے ہیں جو تقریباً آپ کے مضمون میں بھی ہیں لیکن ان مباحث وتوجیحات کے علاوہ بھی بعض ان اعتراضات کا محاکمہ کیا گیا ہے جو سیماب پر وارد کئے گئے ہیں۔ میں نے شعر کے متن سے بھی بحث کی ہے۔ مصرعہ اولیٰ کا متن چاہے جو کچھ ہو آنکھوں کی مناسبت سے بیمار کا قافیہ اور لفظ تاکید'ہی' بہت مناسب ہیں بطن شعر میں جو مفہوم پوشیدہ ہے اس کو میں نے اپنے عملی تجربات ومشاہدات سے ثابت کیا ہے۔

میں چونکہ اپنے مضمون میں خاکسار کے حوالے سے تمام مباحث یکجا کر چکا ہوں لہٰذا آپ کا مضمون فی الحال تو شاعر میں دیا نہیں جا سکتا ہاں اصلاح سخن کی روایت ضرور بھجوایئے لیکن مضمون ذرا صاف، واضح اور حوالے پوری صراحت کے ساتھ ہوں۔

مبارکباد کہ آپ کو بھی ان موضوعات سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ نئی شاعری پر

اپنے معاصرین پر، وہ جو آپ کے ہم عصر شعراء ہیں ان پر بھی مضامین لکھئے۔
جواب کا انتظار رہے گا۔زیادہ خیریت
مخلص
افتخار امام صدیقی

۳

بمبئی
۷/اگست

برادرم فرید پربتی
آپ کے دونوں خط مل گئے ہیں۔ شعری تخلیقات اور دفتر فصاحت کے بارے میں تفصیلات مع عکس۔

شاعر کے مئی اور جون کے شمارے مطالعے میں آئے ہوں گے۔اب خاص نمبر کی جلد اول شائع ہونے والی ہے۔ انشاء اللہ اکتوبر ۱۹۹۶ء تک۔ شعبے کی لائبریری اور یونیورسٹی کی دیگر لائبریریوں کیلئے شاعر کی ترسیل کی تجویز کی کوئی عملی صورت؟

اردو شاعری میں اصلاح سخن کی روایت، ایک بہت وقیع و وسیع تحقیقی موضوع ہے۔اس پر ضرور کام کیجئے۔ میرا ہر ممکنہ تعاون آپ کے ساتھ ہے۔شاعر کے خاص نمبر میں دبستانِ اکبرآباد، آگرہ اسکول اور سیماب کے حوالے سے علامہ کی مشہور زمانہ متنازعہ کتاب دستور الاصلاح کا تعارف اور اس میں شامل ایک شعر کو بطور محاکمہ پیش کر رہا ہوں۔

دستور الاصلاح میں فراہم کروں گا اگرچہ کتاب نایاب ہے۔ اس کے زیراکس پر جو بھی خرچ آئے گا میں آپ کو بتادوں گا۔آپ کے پاس اس موضوع پر کون کونسی کتابیں موجود ہیں؟ کتابیں مل جائیں گی۔لوگ بھی مل جائیں گے۔ ہندوستان بھر میں کئی بزرگ ہیں جو اس موضوع پر آپ کی مدد کرسکتے ہیں۔میں ان

کے نام اور پتے ارسال کروں گا۔

خاص نمبر کی تیسری جلد میں اس موضوع کو نئی معنویت کے ساتھ پیش کرنے کا ارادہ ہے۔ اردو شاعری میں اصناف و ہیئتوں کا جو تنوع تھا وہ ختم ہو گیا ہے۔ غزل، آزاد نظم اور نثری نظم. پابند نظم، بڑی شاعری کا تصور ختم ہو گیا۔ ترقی پسندوں اور جدیدیوں نے فن کا خون کر دیا ہے۔ پھر بھی نئی نسل میں عروض سے دلچسپی رکھنے والے موجود ہیں۔ ایک فیچر ترتیب دے رہا ہوں۔

پہلے آپ اس موضوع پر تمام کتابوں کا مطالعہ کیجئے۔ موضوع کی تمام جزیات پر غور کیجئے۔ شذرات لکھیئے یہ سب کچھ آسان نہیں ہے مگر دلچسپ ضرور ہے۔ عروضی مسائل میں کوئی کسی سے متفق نہیں ہوتا لہٰذا بحث و تمحیص جاری رہتی ہے۔

جواب کا انتظار رہے گا۔

مخلص

افتخار امام صدیقی

(۴)

بمبئی

۴ر اپریل ۱۹۹۷ء

برادرم فرید پربتی

بہت دنوں سے آپ کا کوئی خط نہیں آیا۔ میرے تفصیلی خط کا جواب بھی آپ نے نہیں دیا اور نہ ہی اپنا مقالہ ''اصلاحِ سخن کی روایت'' ارسال کیا۔ آپ کا مقالہ تکمیل پذیر ہوا کہ نہیں؟ مجھے انتظار ہے۔

اس دوران شاعر کے دو شمارے (جنوری، فروری ۹۷ء) آپ کے مطالعے میں آئے ہوں گے۔ یہ دونوں شمارے آپ کو کیسے لگے؟ مارچ کا شمارہ جلد شائع ہو رہا ہے، پریس میں ہے۔ اس میں آپ کی ایک غزل شامل کی ہے۔ اس شمارے کے بعد ہم عصر اردو ادب نمبر کی جلد اول شائع ہو گی۔

جلد اول میں آگرہ اسکول اور دبستانِ سیماب کے تحت علامہ سیماب اکبر آبادی کی مشہور زمانہ متنازعہ کتاب دستور الاصلاح کا تعارف دے رہا ہوں، ساتھ ہی خاکسار کے شعر پر بحث کو سمیٹا ہے۔ آپ کے مضمون سے استفادہ کیا ہے۔
آپ نے اپنے مضمون کے آخر میں جو یہ تحریر کیا ہے:

"چونکہ سیماب وغیرہ اصل متن کا تعین نہیں کر سکتے ہیں اسی وجہ سے وہ اصل نتیجہ اخذ کرنے سے قاصر رہے ہیں اور جس طرح میر نے مرزا مظہر جان جاں کے گروہ کے خلاف رواروی میں سرسری اور بے دلیل فیصلے صادر کئے ہیں اسی طرح سیماب اور بعد کے اربابِ نقد و نظر نے زیر بحث شعر کے ساتھ یہی سلوک رکھا ہے"۔

میں نے اپنے گذشتہ خط میں آپ کو لکھا تھا کہ سیماب نے خاکسارؔ کے شعر پر میرؔ کی اصلاح میں توجیہ کے طور پر اپنی کوئی رائے نہیں دی بلکہ لکھا کہ بقول میر حسن...... یعنی میر حسن نے میرؔ کی اصلاح پر جو رائے تذکرہ شعرائے اردو میں دی تھی، سیماب نے...... اپنی کتاب میں توجیہ کے طور پر نقل کر دیا گویا میر حسنؔ کی رائے سے اتفاق کیا۔ میر حسن اور سیماب نے قافیہ 'بیمار' ہی کو درست سمجھا ہے یعنی شعر میں اصلاح کی ضرورت نہیں تھی۔ لفظ "ہی" صرف تاکید اور شعر کی جان ہے۔
میری بحث کچھ اور ہے۔ رہا سوال متن کا تو اس میں اصل یا تحریف کا اول تو کوئی مسئلہ نہیں ہے اور اگر ہو بھی تو مصرعہ اولیٰ کے جس ٹکڑے سے بحث کی جا رہی ہے وہ اتنا اہم نہیں ہے۔ لفظ آنکھیں ہی بنیادی اور کلیدی ہے۔ خاکسار اس کو تو آنکھوں...... مت لگیو، بہت کافی ہے، سے گھنے، کے کہنے مصرعے کی تکمیل کیلئے ہے اور مفہوم میں اس ٹکڑے سے کوئی تبدیلی بھی واقع نہیں ہوئی۔
اب سوال یہ ہے کہ آپ کیا سمجھے؟ یا کیا سمجھ کر سیماب کو غلط بتا رہے ہیں؟ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ من آنم کہ من دانم۔
ابر احسنی اور ان کے تلامذوں نے بر بنائے مخاصمت سیماب پر لایعنی

اعتراضات کئے ہیں۔ یہ سارے اعتراضات تو میر حسن کیلئے ہونے چاہئے، سیماب کے کھاتے میں کیوں؟ اعتراضات بھی مضحکہ خیز ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے تو دستور الاصلاح بہت زمانہ پہلے پڑھی تھی، ایک ہلکا سا خاکہ ان کے ذہن میں ہے۔ دونوں کتابوں کے تقابل کے بغیر ہی انہوں نے بھی اعتراضات جڑ دیئے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ سارے معترفینِ سیماب، خوبصورت آنکھوں کے اسیر اور بیمار چشمہ نہیں ہوئے۔ زلف گرہ گیر بیمار چشم کے بارے میں کیا خیال ہے؟ میں نے اپنے تعارفی مضمون میں اسی نوع کی بحث کی ہے اور بھی کئی باتیں ہیں۔ آپ نے اپنی شاعری پر کس سے اصلاح کی ہے؟

ان دنوں کیا مصروفیات ہیں؟

جواب کا انتظار رہے گا۔

مخلص

افتخار امام صدیقی

۵

بمبئی

۲۳ر جولائی ۱۹۹۷ء

برادرم فرید پربتی

آپ کی ارسال کردہ رجسٹری مل گئی۔ اس کی رسید دی ہے میں نے۔ آج آپ کا تحقیقی مقالہ واپس ارسال کر رہا ہوں۔ فی الحال خاص نمبر کی تین جلدوں میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ کسی اور رسالے کو ارسال کر دیجئے۔

آپ کو مجھ سے جو شکایت ہے اس کے میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے کیونکہ آپ کا خوبصورت اور معیاری کلام بقول آپ کے 'مبتدیوں' کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ دھنک رنگ سے مراد نئے اور مبتدی شعراء نہیں بلکہ تازہ کار لب و لہجے کے شعراء، مزاج و معیار سے قدرے مختلف آپ کے ساتھ جتنے بھی نام ہیں وہ

مبتدی نہیں ہیں۔ تمام ہی نام ۱۹۸۰ء کے آس پاس ابھر کر آئے ہیں۔ محمد علی عاجز صاحب تو آپ سے بھی سینئر ہیں۔ ہاں! مجھ سے یہ غلطی ضرور ہوئی کہ چونکہ آپ بہت دنوں سے شاعر میں شائع نہیں ہوئے تھے۔ خاص نمبر غیر یقینی حالات کی نذر ہوا اور عام شماروں کی اشاعت میں بے ترتیبی کا احتمال۔ چنانچہ شماروں کی ترتیب کے بعد کی جانے والی تبدیلی اور کمپیوٹر کمپوزنگ کی سہولت کے تحت آپ کو فوری طور پر شامل کر لیا۔ غزل میں کیا کتر بیونت ہوتی ہے؟ اپنے اصل مسودے سے موازنہ کر کے بتایئے گا۔ اور یہ کہ اگر کتر بیونت ہوتی ہے تو کیا وہ غیر مناسب ہے؟

میں تو خیر ابھی صحیح معنوں میں مبتدی بھی نہیں ہوں
صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا

بہر حال آپ میرے بڑے بھائی ہیں، آئندہ خیال رکھوں گا، خاص نمبر کی مصروفیات بے طرح ہیں۔ اب جلد اول آیا ہی چاہتی ہے۔ زیادہ خیریت

مخلص

افتخار امام صدیقی

۶

بمبئی

۱۰ر جون ۱۹۹۸ء

برادرم فرید پربتی

آپ کا تفصیلی مضمون خاکسار کے شعر سے متعلق پڑھ لیا ہے۔ مگر جس نکتے سے بحث کا آغاز ہوا آپ بھی اس میں الجھ گئے۔ میر حسن کی رائے کو سیماب نے توجیہ کے طور پر نقل کیا ہے اور حواشی میں اس کا حوالہ بھی دے دیا ہے۔ ابر احسنی نے اسے سیماب کی رائے بلکہ اصلاح سمجھا۔ اس نے سیماب کا اعتراض ثابت کرتے ہوئے غیر ضروری ایراد کیا۔ شعر کے مصرعہ اولیٰ میں گھیے کی جگہ ''گھنے'' دوسرے

مصرے میں 'ہی' حرفِ تاکید اور قافیہ 'بیمار'۔ آنکھوں کی مناسبت سے یہ سب کچھ شعر کی جان ہیں۔ شعر کی وہ قرأت جو محمود الٰہی سے شمس الرحمٰن فاروقی تک آئی ہے اور شعر کی وہ قرأت جو میر حسن سے سیماب تک پہنچی ہے۔ آپ دونوں ہی طرح سے خود کو باآواز بلند سنائیے یا شعر کے ساتھ دوسروں کو سنائیے اور فرق محسوس کیجیے۔

خاکسار کا شعر، آج کا شعر معلوم ہوتا ہے:

خاکسار! اس کی تو آنکھوں سے گھنے مت لگیو
مجھ کو ان خانہ خرابوں ہی نے بیمار کیا

شاعر کے خاص نمبر کی دوسری جلد میں دستورالاصلاح پر میرا مضمون شائع ہوا ہے۔ اس میں آنکھوں کے بارے میں میرے عملی تجربے اور مشاہدے درج ہیں۔ شعر کا اصل چہرہ اور تمام اصلاحوں کا معروضی جائزہ ہے۔

جنوری تا مئی ۱۹۹۸ء کے شمارے آپ نے دیکھے ہوں گے؟ یہ شمارے کیسے لگے؟

جون کا شمارہ شائع ہونے والا ہے خاص نمبر بائنڈنگ میں ہے۔

زیادہ خیریت — مخلص

افتخار امام صدیقی

۷

بمبئی

۱۲؍اگست ۲۰۰۳ء

عزیزی فرید پربتی۔ دعائیں۔

تمہارا ۶؍اگست کا تحریر کردہ تفصیلی خط ملا۔ میں ۹؍اگست کو ہسپتال سے گھر آگیا ہوں۔ آپریشن کامیاب رہا۔ اب مجھے تین ہفتوں تک مکمل Bed Rest

کی ہدایت ہے۔ ایک ماہ بعد چیک اَپ ہوگا۔ فی الحال تو پڑھنا اور کچھ لکھنا دوبھر معلوم ہوتا ہے۔ تم ایک اہم کام کررہے ہو لہٰذا فوری جواب دینے کی کوشش کررہا ہوں۔

میری علالت کے دوران (جو ۱۱ر مارچ ۲۰۰۲ء سے جاری ہے) شاعر کے کام متاثر ہوئے ہیں، خاص طور پر کاروبار خطوں کے جواب نہیں جارہے ہیں، ڈاک کے پشتارے لگ رہے ہیں۔ اور ایک ماہ میں تو گویا سیلاب آ گیا ہے ناظر بھائی آفس، مجھے اور بیماریاں کو دیکھیں کہ کاروبار کو دیکھیں۔ آفس اور گھر میں بہت فاصلہ ہے۔ میں بمرول (نوی ممبئی) میں ہوں۔

علامہ شارق جمال کا نام اس لئے تجویز کیا تھا کہ ان کے پاس علامہ سیماب کی دستور الاصلاح اور ابر احسنی کی اصلاح الاصلاح ہے۔ اس کے علاوہ میر حسن کی نکاتِ سخن بھی ہے۔ میرے حوالے سے خط لکھیں گے تو وہ ان کتابوں کی زیروکس مع رجسٹری ارسال کردیں گے۔ آپ انہیں اخراجات بذریعہ منی آرڈر بھجوا دیجئے گا۔ بڑے بھائی کی مصروفیات دیکھتے ہوئے اصرار کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ بول و براز صاف کرنا، بستر صاف کرنا وغیرہ وغیرہ۔ میں نے شادی تو کی نہیں کہ یہ سارے نجی کام بیوی ہی کرسکتی ہے۔

عنوان چشتی صاحب نے ابر مرحوم پر خاصہ کام کیا ہے لیکن انہوں نے سیماب پر اعتراضاتِ ابر کو صحیح قرار دیا ہے۔

عروض دانوں میں ناوک حمزہ پوری، شمس الرحمٰن فاروقی، ظہیر غازی پوری وغیرہ بھی ہیں۔

آپ اپنا کام جاری رکھئے۔ جہاں میری ضرورت ہوگی میں حاضر ہوں۔

میری اصلاحیں (جوش ملسیانی) بھی دیکھئے گا۔ دو حصوں پر مشتمل کتاب ہے۔

خاکسار کے شعر پر میر تقی میر کی اصلاح اور پھر میر حسن کا اعتراض نظام سے زیر بحث آیا ہے۔ کھلے ذہن کا پڑھا لکھا آدمی ہے اس کے بہت سارے شاگرد

ہیں۔ حضرت شہ زور کاشمیری (تلمذ علامہ سیماب) کے شاگرد بھی عروض سے واقف ہیں۔ کشمیر میں اور بھی لوگ ہوں گے۔

کتاب بہت بھرپور ہونی چاہیے۔ اپنا مطمح نظر بالکل غیر جانبدارانہ ہونا چاہیے۔

اگست کا شاعر موصول ہوا ہوگا۔ ستمبر کا شاعر زیر ترتیب ہے۔ خط اب ختم کرتا ہوں۔ بیٹھا نہیں جا رہا ہے۔

اپنا خیال رکھنا۔

مخلص

افتخار امام صدیقی

۸

بمبئی

۳/اکتوبر ۲۰۰۳ء

برادرم فرید پربتی! سلام مسنون

ایوان اُردو (دہلی) کے تازہ شمارے میں آپ کا مضمون خاکسار کے شعر پر میر کی اصلاح پڑھا اور فوری طور پر خط لکھ رہا ہوں۔ مضمون بہت عمدہ اور بڑی بحث سے لکھا گیا ہے۔ اب آپ کی کتاب کا انتظار ہے۔ میرا خاکہ تو شاعر کے دفتر میں میرے کاغذات میں کہیں گم ہے اور میں فی الحال اپنی امی جان کے میت میں ہوں دو ماہ بعد دفتر جانا شروع کروں گا تو پھر تمام خاکوں پر نظر ثانی کروں گا۔ ویسے میرا خیال ہے کہ میر حسن نے 'گھنے' ہی لکھا ہے جو مجھے زیادہ پُر لگ رہا ہے۔ کھے اور گھنے کے معنی الگ الگ ہیں لیکن آنکھوں کی مناسبت سے اولیٰ الذکر......زیادہ مناسب لگتا ہے۔

آپ نے دستور الاصلاح اور اصلاح الاصلاح بھی دیکھی ہے۔ اور میرا

خیال ہے کہ میر حسن کی اصلاح سخن بھی دیکھی ہے۔ کیونکہ آپ نے اپنے موضوع کے تمام ممکنہ گوشوں کا احاطہ کیا ہے۔

دستور الاصلاح اور زارِ عروض کی زبردست مانگ ہے فی الحال میں بستر پر پڑا ہوا ہوں۔ دعا کیجئے۔

اکتوبر کا شاعر شائع ہو گیا ہے۔

اپنا خیال رکھئے گا۔

مخلص

افتخار امام صدیقی

۹

بمبئی

۳ دسمبر ۲۰۰۳ء

برادرم فرید پربتی۔ آپ کیسے ہیں!

آپ کی خوب سیرت رباعیوں کا دیدہ زیب مجموعہ 'فرید نامہ' موصول ہوا، دلی مبارکباد اور شکریہ۔

فی زمانہ نئی نسل رباعی کی طرف متوجہ نہ ہوتے ہوئے غیر ضروری اصنافِ شاعری میں اپنا وقت اور اپنی تخلیقی صلاحیتیں ضائع کر رہی ہے۔ یہی تجربہ مزاج بھی تاہم تجربے کا مطلب اعتدال و معیار بھی ہے۔ مناظر عاشق ہرگانوی کا رسالہ "کوہسار" کا تازہ شمارہ دیکھ لیجئے۔

فن رباعی اک مشکل صنف ہے، اساتذہ نے بھی اسے کہاں برتا ہے۔ امجد حیدر آبادی، یگانہ، سیماب، جوش وغیرہم کے نام نمایاں ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے اس فن کو بڑی ہنرمندی سے پامال کیا ہے۔ یہ چہار سمت کا دریا، اسے ......کرنا آسان نہیں۔

پاکستان میں عبدالعزیز خالد کا نام نمایاں ہے۔ وہاں بھی نئی نسل اس فن سے

دور دور ہے۔ صبا اکبر آبادی مرحوم نے رباعیاں کہی ہیں اور کلام بھی کہا ہے۔

البتہ فارسی شعراء نے فن رباعی کو بہت برتا ہے۔ میری لائبریری میں فارسی رباعیوں کا ایک خوبصورت مجموعہ موجود ہے جس میں فارسی کے تمام اہم شعراء کی ایک ایک رباعی دی گئی ہے۔ اس کتاب کا بارڈر بھی رنگین اور ڈیزائن کیا ہوا ہے۔

ہماچل پردیش سے ایک خوب سیرت کتاب فرید نامہ آئی ہے، یہ بابا فرید کے کلام کا انتخاب ہے، گورمکھی، پنجابی، اردو، ہندی اور انگریزی میں ترجمہ کی گئی کافیاں اور اشلوک بہت ہی خوب ہیں، ہر صفحہ ہلکے سرخ رنگ سے سجا ہوا ہے، بابا فرید کی زندگی کا احوال بھی ہے۔ اس کتاب کو زاہد ابرول صاحب نے منظوم کیا ہے۔

'فرید نامہ' پر میں خود تبصرہ کروں گا اور کتاب بازار میں تعارف بھی دیا جائے گا تاہم غیر معمولی تاخیر کا احتمال ہے۔ اس مجموعے کی گونج پوری اردو دنیا میں ہونی چاہئے۔

جنوری ۲۰۰۴ء کے شمارے سے آپ کا شاعر کئی ایک صوری و معنوی تبدیلیوں سے آراستہ کیا جا رہا ہے۔ ان تبدیلیوں کو معیار و وقار عطا کرنے کیلئے مشاہیر قلمکاروں سے تعاون لیا جائے گا۔ جو فہرست میں نے بنائی ہے اس میں ایک نمایاں نام آپ کا بھی ہے۔ دراصل شاعر ادبی ٹرسٹ، اب ناگزیر ہو گیا ہے۔ قلم کاروں سے جو ہدیہ لیا جائے گا وہ اس میں جمع ہوتا رہے گا۔ فنڈس اور کہاں سے حاصل کیا جائے گا یہ بعد میں سوچا جائے گا۔

جنوری کا شمارہ آپ دیکھ کر مجھے خط لکھیں گے تو پھر میں تفصیلات دوں گا کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔

دسمبر ۲۰۰۳ء کا شاعر ۶ رکو پوسٹ کیا جائے گا۔

اصلاحِ سخن پر آپ کی کتاب کا کیا ہوا؟ میرا خط آپ کو مل گیا ہوگا؟ آپ کے مضمون کے جواب میں محترمی ڈاکٹر عثمانی نے ایک بحث طلب مضمون 'ایوان اردو'

کوارسال کیا ہے اس کی ایک کاپی مجھے بھی بھجوائی ہے۔

آپ کی کتاب ہنگامہ خیز ہوگی۔

۲۰۰۰ء میں علامہ سیماب کی بحث طلب کتاب دستورالاصلاح شائع کروں گا۔ پہلے آپ کی کتاب آجائے۔ اصلاحِ سخن ایک مستقل موضوع ہے میں شاعر میں گا ہے گا ہے اس موضوع پر اساتذہ کی اصلاحیں جو کہ شاعر (آگرہ) کی فائلوں میں محفوظ ہیں دیتا رہوں گا۔

کیا آپ نے شہ زور کاشمیری مرحوم سے اصلاح لی تھی؟ حامدی کاشمیری صاحب بھی ان ہی کے شاگرد ہیں۔ مرحوم پر آپ کی کتاب میں نے دیکھی نہیں ہے، کیا ارسال کرنے کی زحمت کریں گے؟

اپنی تازہ و غیر مطبوعہ رباعیاں شاعر کیلئے ارسال کیجئے۔

مخلص

افتخار امام صدیقی

پروفیسر قاضی عبیدالرحمن ہاشمی

۱

جامعہ نگرنئی دہلی
یکم اگست ۱۹۹۳ء

برادرِعزیز۔ سلام مسنون

گرامی نامہ مورخہ ۱۹؍جولائی موصول ہوا، میں آپ کی خیرو عافیت کیلئے کتنا مضطرب رہتا ہوں، اس کا آپ کو اندازہ نہیں ہوسکتا۔ ویسے بھائی کی محبت بھری شکایت کو بھی میں سرآنکھوں پر جگہ دیتا ہوں۔ آپ تو مصروف تھے ہی لیکن ادھر میں بھی ۳۔۴ ہفتوں کیلئے (جون اور جولائی) بالکل اچانک ایک پروگرام کے تحت تاشقند چلا گیا تھا، میرے ساتھ اسرار بھائی بھی گئے تھے لیکن ان کا مقصد سیاحت و تجارت تھا اور میں وہاں لیکچرس کیلئے گیا تھا۔ بڑا پُرلطف سفر رہا، چونکہ وہاں کی مصروفیات بے حد غیر معمولی تھیں اس لئے ہر روز ارادہ کرنے اور سوچنے کے باوجود بھی آپ کو خط نہ لکھ سکا۔ آپ کی شاعری پر لکھا گیا مضمون (رف نوٹس کی شکل میں میرے پاس تھا جو میں نے اردو سروس (آل انڈیا ریڈیو) کیلئے لکھا تھا اور جو ۲۳؍جون کو شب میں نشر ہوا تھا) میں صاف کرکے آپ کے پاس بھیجنا چاہتا تھا، سو وہ بھی نہ ہوسکا، مضمون مستقل میرے ساتھ رہا لیکن اس کی نوک پلک سدھارنے کا کام آج ہی ہوسکا اور آج ہی یہ آپ کی خدمت میں روانہ کیا جارہا ہے۔ مضمون کے مطالعہ سے آپ محسوس کریں گے کہ یہ دوستی نبھانے کیلئے نہیں لکھا گیا ہے یہ قدرے معروضی مطالعہ ہے اور ظاہر ہے آپ کو کسی بیساکھی کی ضرورت ہے بھی نہیں، آپ کے یہاں جو مضبوطی اور اعتماد ہے وہ آپ کو مستحکم

کرنے کیلئے کافی ہے۔اس کی ایک کاپی قومی آواز کے ادبی حصہ کیلئے رکھ لیا ہے یا پھر ہماری زبان میں اشاعت کیلئے بھیج دوں گا بقیہ آپ کے پاس جو نقل بھیج رہا ہوں، آپ چاہیں تو شیرازہ میں دے سکتے ہیں۔

میں بے حد احسان مند ہوں کہ آپ نے زحمت کر کے میرے لئے بازیافت کے متعدد شمارے بھیجے، شہہ زور پر آپ کی کتاب بھی مل گئی ان سب کیلئے بیحد شکریہ۔

قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی

۲

جامعہ نگر نئی دہلی

۱۸؍مئی ۱۹۹۸ء

برادر عزیز سلام مسنون

قبلہ والد صاحب کا سایہ عاطفت اُٹھ جانے سے آپ جس طرح صدمات سے دوچار ہوں گے اس کا اندازہ کر سکتا ہوں۔ خدا کرے آپ اس صدمے کو انگیز کر سکیں۔ خدا آپ کو قوت اور ہمت عطا فرمائے آمین! والدہ صاحبہ کی حالت کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ رب العزت آپ سب کو اس غم کے برداشت کی صلاحیت عطا کرے۔ ہم سب بے حد غمگین ہیں اور باری تعالیٰ سے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ محترم خسر صاحب کیسے ہیں وہ بھی علیل تھے۔ کہاں ہیں؟ بازیافت ملا تھا اس میں آپ کا مضمون دیکھا بڑی مسرت ہوئی۔ خوشی ہوتی ہے کہ آپ ہر حال میں زندگی کرنے کا ہنر جانتے ہیں اور چارہ ہی کیا ہے۔ ہم لوگ بخیریت ہیں۔ آپ سب کو بہت یاد کرتے ہیں۔

تمہارا

قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی

(۳)

جامعہ نگر، نئی دہلی

۱۸؍جنوری ۲۰۰۵ء

برادر گرامی قدر۔ سلام مسنون

فون کرنے کی بھرپور کوشش کر کے تھک گیا، معلوم نہیں کیا قصہ ہے، لائن میں خرابی ہوگی، مجھے یقین ہے کہ آپ کی تخلیق تصنیف آپ تک پہنچ گئی ہوگی اس لئے کہ میں نے تقریباً ہر روز ان لوگوں سے تقاضا کر کے یہ اطمینان کر لیا تھا کہ اب یہ لوگ زیادہ جھوٹ نہیں بول سکتے۔ ہاں میں نے ابھی تک کتاب کی زیارت نہیں کی ہے۔ سو وہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں اطمینان سے استفادہ کروں گا۔ دوسرا مسئلہ جس کے بارے میں فون پر میں بات کرنا چاہتا تھا وہ بھی بحمد اللہ میری طرف سے ٹھیک ٹھاک ہو گیا تھا۔ جو بھی مجھے کام کرنا تھا، کر کے بذریعہ رجسٹری بھیج دیا تھا۔ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے خدا کرے وہ خبر آئے جس کی مجھے توقع ہے۔

ادھر غزلیں کم آرہی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ نثر کی طرف توجہ زیادہ ہے۔ ابھی آزردہ صاحب تشریف لائے تھے۔ سرسری بھی ملاقات رہی غالب انسٹی چیوٹ میں مرزا انیس و دبیر پر سمینار تھا اس میں وہ بھی شریک تھے۔

پروفیسر نذیر احمد ملک صاحب کی کتاب بہت کار آمد اور قابل تعریف ہے ان کا کرم ہے کہ وہ مجھے بھی یاد رکھتے ہیں اور اپنی کتابیں بھیج دیتے ہیں ان کی خدمت میں سلام کہہ دیں۔ ان کو الگ سے خط لکھ رہا ہوں دہلی کب تک آنے کا پروگرام ہے۔ لوگ سرما میں دہلی کا رُخ کرتے ہیں اور آپ ہیں کہ گرما میں نکلتے ہیں۔ شاید اس کا نام انفرادیت ہے البتہ بحمد اللہ سب خیریت ہے۔ باقی والسلام

مخلص

قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی

پروفیسر کمال احمد صدیقی

اردو اکادمی دہلی

برادر عزیز ڈاکٹر فرید، دعائیں

آپ کے ۱۶/۱ اکتوبر کے خط کے ساتھ اسعد بدایونی مرحوم پر مضمون ملا۔ شکریہ۔ اسعد کی وفات پر ایوان اردو میں کوئی مضمون شائع نہیں ہوا۔ آپ کے اس مضمون سے یہ کمی پوری ہو جائے گی۔ میں نے آپ کا مضمون عابدی صاحب کو اشاعت کیلئے بھیج دیا ہے۔

صفحہ ۶ پر میر کے شعر کی قرأت درست نہیں تھی۔ درست کر دی ہے۔ صفحہ ۵ پر دوسرے شعر پر شاید آپ کی نظر نہیں گئی۔ پہلا مصرع سات رکنی متعارب مقبوض محذوب الآخر اور دوسرا مصرع سات رکنی متدارک مجنون احذ الآخر میں ہے۔ فٹ نوٹ میں اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔

یقین ہے بعافیت ہوں گے اور سب عزیز اور احباب کو واجبات۔ اپنے دوستوں اور شاگردوں کو ایوانِ اردو میں لکھنے کی ترغیب دیجئے۔

پروفیسر جاوید قدوس کو خاص طور سے توجہ دلایئے۔

آپ کا

ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

●□●

شمس الرحمن فاروقی

الہ آباد

۲۴نومبر۲۰۰۳ء

برادرم فرید پربتی، السلام علیکم، عید مبارک

آپ کی دلچسپ کتاب ''فرید نامہ'' ملی شکریہ۔ کتاب خوبصورت چھپی ہے اور یہ بات میرے لئے خوشگوار تعجب کا باعث ہوئی کہ پوری کتاب رباعیوں پر مشتمل ہے۔ مجھے نہیں خبر تھی کہ آپ رباعی میں اس قدر مہارت رکھتے ہیں۔ آپ نے فارسی کے شعر بھی جگہ جگہ خوب نقل کئے ہیں اگرچہ بعض اشعار کی قرأت کچھ درستی کا تقاضا کرتی ہے۔

آپ نے مجھے معروف نقاد لکھ کر شرمندہ کیا۔ اس سے تو اچھا تھا کہ کچھ نہ لکھتے۔

آپ کا نیاز مند

شمس الرحمٰن فاروقی

پروفیسر عبدالحق

دہلی یونیورسٹی دہلی

یکم جولائی ۱۹۹۸ء

عزیز مکرم سلام مسنون

کل کی ڈاک سے آپ کا تحفہ بے مثال موصول ہوا۔ ایک سرسری نظر ڈالی مسرت ہوئی کہ آپ بہت اچھا تخلیقی اکتساب رکھتے ہیں۔ مختصر بحروں پر عبور کے ساتھ مفاہیم کی بے کرانی کو منضبط کرنا ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔ مگر آپ نے التزام کیساتھ کامیابی حاصل کی ہے۔ عصری فکر کے بعض پہلو اشعار میں محفوظ ملے اور انہیں سلیقہ اظہار بھی دیا گیا ہے تخلیقی مزاولت کو جاری رکھئے۔ ایک منزل پر ٹھہر جانا آپ کی اور آپ کے فن کیلئے مضرت رساں ہے۔ اور خود خالق دو جہاں سے توفیق مزید بھی طلب کرتے رہئے۔ کیونکہ وہی منبع خلق بھی ہے اور احسن الخالقین

بھی۔ نام سے ہی آپ کے ذہنی رویئے (اثبات) کا پتہ چلتا ہے۔ جو بہت محترم اور میرے لئے مقرب بھی ہے یہی اعتراف تخلیق پارے کو توثیق و تعمیر بخشتا ہے۔

ناچیز
عبدالحق

پروفیسر عبدالمغنی

پٹنہ (بہار)

۱۳/اپریل ۱۹۹۲ء

برادرِ عزیز　　　　السلام علیکم

عنایت نامہ ملا، پرسش احوال کے لئے شکریہ۔

میں اب خدا کے فضل سے بہت اچھا ہوں اور معمولات میں مشغول، گرچہ ابھی صحت مندی میں تھوڑی کسر باقی ہے۔

مجموعۂ کلام پر تبصرہ ارسال کر رہا ہوں۔ اس کو مخلصانہ مشورہ سمجھئے اور ذاتی بہی خواہی پر محمول کیجئے۔

صفحہ ۱۲۷/ پر پس نوشت کے نیچے جو شعر آپ نے مرزا غالبؔ سے منسوب کیا ہے کہ غالباً اقبالؔ کا ہے، تحقیق کر لیجئے۔

خدا کرے آپ بخیر ہوں۔

پروفیسر عبدالمغنی

پروفیسر شمیم حنفی

نئی دہلی

۳دسمبر ۲۰۰۳ء

عزیزم فرید صاحب السلام علیکم

فرید نامہ کی ایک کاپی ملی۔ بہت شکر گذار ہوں۔ آپ کے اندر نظم ونثر کی صلاحیتیں غیر معمولی ہیں۔ یہ بات بھی قابل قدر ہے کہ آپ مشکل اصناف اور علمی و ادبی مسائل سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔

اچھی رباعی کہنا ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں۔ فرید نامہ پر مبارک ہو۔ امید کہ آپ بخیر ہوں گے۔

خیر طلب
شمیم حنفی

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

تریوپتی آندھرا پردیش

۱۵/مارچ ۱۹۹۰ء

محبی: آداب!

کبھی میں نے لکھا تھا کہ کشمیر حاضر ہو رہا ہوں، آپ سے ملاقات ہوگی اور آپ کی شاعری پر اپنے تاثرات بہم پہنچا دوں گا لیکن کسی نہ کسی باعث یہ صورت

نکلی اور پتہ نہیں ابھی کتنے دنوں تک یہ بات ملتوی رہے۔ اِدھر ''شاعر'' کے تازہ شمارے میں آپ کی غزل پڑھنے کو ملی، سوچا اب اپنے تاثرات روانہ ہی کر دینا چاہیئے۔ منسلک ہیں، وصولی کی اطلاع سے نوازیں۔

اپنے احباب سے سلام کہیئے اور اِدھر شعبہ میں پروفیسر حامدی کاشمیری صاحب، ڈاکٹر برج پریمی صاحب، ڈاکٹر قدوس جاوید صاحب ، ڈاکٹر نذیر صاحب اور دیگر تمام سے۔

امید کہ آپ سب اچھے ہوں گے۔

آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔

مخلص

سلیمان اطہر جاوید

پروفیسر تفضل حسین

سرینگر

۲۹ جولائی ۱۹۹۹ء

محترم ڈاکٹر فرید پربتی صاحب

السلام وعلیکم

آپ نے کمالِ ذرہ نوازی سے مجھ کو اپنی گراں قدر کتاب ''اثبات'' مرحمت کی اور وہ پرسوں ۲۷ر جون کو ملی۔ انتہائی ممنوں ہوں۔ کتاب دیکھ کر خوشی ہوئی کہ سرزمین کشمیر میں آج بھی آپ جیسے صاحب نظر لوگ موجود ہیں۔

آپ کی رباعی

ہے محو عبادت شیخ اب شام و پگاہ
غلماں پر نظر اور ہے حوروں پہ نگاہ
اللہ کو سمجھتا ہے یہ حور فروش
لاحول ولاقوۃ الا باللہ

بہت پسند آئی۔ اس کا شمار اردو کی بہترین رباعیوں میں ہونا چاہئے۔ یہ صنف رباعی کی "Text book example" ہے اور درسی کتابوں (کم از کم کشمیر بورڈ کے درسی نصاب) میں شامل ہونی چاہئے۔ صفحہ ۷۶ پر رباعی کا آخری مصرعہ ''ہوں مرغ مگر آگ غذا ہے میری'' کے پردے میں غنیؔ کے مصرع ''شعلہ شاخِ گل بود مرغانِ آتش خوار را'' کا رنگ جھل رہا ہے۔ غنیؔ کی یاد تازہ کرنے کیلئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

اخیر میں آپ سے ایک گزارش کروں گا۔ آپ کو فارسی اور اُردو دونوں زبانوں پر دست رس ہے۔ کشمیر کی Research Libraries میں فارسی مخطوطوں اور کتابوں کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اگر اُن کا متن مع اردو ترجمہ شائع ہو تو کشمیر کے کلچر کی زبردست خدمت ہوگی۔ بسم اللہ آپ دیوان غنیؔ سے ہی کر سکتے ہیں اور جس طرح قاضی سجاد حسین وغیرہ نے مثنوی مولانا روم، دیوانِ حافظ، گلستان و بوستان وغیرہ کا فارسی متن مع اردو ترجمہ شائع کیا اُسی طرح اگر آپ بھی دیوان غنیؔ کا فارسی متن مع اردو ترجمہ شائع کریں گے تو یہ ایک بہت بڑی خدمت ہوگی۔

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

نیاز مند
تفضّل حسین

پروفیسر انور الدین

۱

حیدر آباد ۵۰۰۰۰۱

۲۸ رنومبر ۲۰۰۳ء

برادرم ڈاکٹر فرید پربتی صاحب

السلام علیکم

آپ کی رباعیات کا مجموعہ ''فرید نامہ'' ملا۔ بے حد شکریہ۔ آپ نے اس مبارک موقعہ پر مجھے یاد رکھا اس کیلئے ممنون ہوں۔ ''فرید نامہ'' کی اشاعت کیلئے میری جانب سے مبارکباد قبول فرمایئے بہت ہی خوبصورت و دیدہ زیب ٹائٹل، کمپوزنگ کاغذ، طباعت دیکھ کر جی خوش ہوگیا۔ اور کلام میں تازگی سونے پہ سہاگہ......اللہ کرے زور قلم اور زیادہ......۔

اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و سلامتی عطا فرمائے اور درجات میں ترقی دیئے (آمین) ہماری یونیورسٹی جس عنقریب دو ریڈر اور ایک لیکچرار کا پوسٹ مشتہر ہونے والا ہے۔ اشتہار آتے ہی اس کی ایک کاپی آپ کو روانہ کروں گا اس کی کافی تشہیر کیجئے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ درخواستیں آسکیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ضرور Apply کیجئے۔ یکم جنوری ۲۰۰۴ء سے انشاء اللہ تعالیٰ مجھے دوبارہ صدر شعبہ کی ذمہ دار قبول کرنی پڑے گی۔

فرید نامہ کے تعلق سے چند تاثرات ذیل میں درج کر رہا ہوں:

رباعی اصناف سخن میں سب سے مشکل مانی جاتی ہے۔ اختصار نظام قوافی اور بحروں کی پابندی ان سب دشواریوں پر قابو پا کر ہی رباعی کہی جا سکتی ہے۔ اس کیلئے مناسبت طبع اور مہارت سخن لازمی ہے۔ دورِ حاضر میں رباعی کا چلن کم سے کم تر ہوتا جارہا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر فرید پربتی نے اس مشکل صنف کو اپنے

تخلیقی اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ وہ مسلسل رباعیاں کہہ رہے ہیں۔ ''فریدنامہ'' ان کی رباعیات کا مجموعہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ نئی نسل کے شاعروں میں فرید پربتی کلاسیکی روایات کے تحفظ اور تسلسل کے علمبردار ہیں۔ ان کی رباعیوں میں حسن بیان بھی ہے اور فہم و فراست پر مبنی بصیرت افروز نکات بھی۔ کلاسیکی روایات کی پاسداری کے باوجود فرید پربتی کے ہاں فکر و احساس کی ندرت اور اظہار کی تازگی پائی جاتی ہے۔ پیش نظر مجموعہ معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ صوری خوبیوں کے اعتبار سے بھی لاجواب ہے۔ دیدہ زیب سرورق روشن کتابت، عدمہ طباعت اور نفیس کاغذ پر مشتمل یہ مجموعہ فردوسی نظر کا منظر پیش کرتا ہے''۔

امید کہ آپ بخیر ہوں گے۔ آپ کو اور اہل خانہ کو میری جانب سے عید کی مبارکباد پیش ہے۔ آپ حیدرآباد کب تشریف لا رہے ہیں۔ ضرور مطلع کیجئے۔ گھر میں اور شعبے میں سب کو سلام کہیے۔

فقط

آپ کا

محمد انورالدین

۲

حیدرآباد

۴ر اکتوبر ۲۰۰۵ء

محترمی و مکرم فرید صاحب

تسلیم

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ اردو کے مشہور محقق و نقاد، عالم لسانیات و ماہر دکنیات پروفیسر سید محی الدین قادری زور کی صد سالہ تقاریب کے ضمن میں شعبہ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد کے زیر اہتمام ۲۰ر تا ۲۲ ستمبر ۲۰۰۵ء

منعقدہ سہ روزہ قومی سمینار میں آپ کی تشریف آوری اور مقالے کی پیشکش اور اجلاس کی صدارت کیلئے ہم آپکے بے حد ممنون اور سپاس گزار ہیں۔ آپ کی آمد ہمارے سمینار کے وقار و اعتبار میں اضافہ کا مؤجب ہوئی۔ آپ نے اپنی مصروفیات میں سے ہمارے لئے وقت نکالا اور سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے سمینار میں شرکت کرنے کی زحمت گوارا کی اس کے لئے میں اور میرے شعبہ کے رفقاء آپ کے اس مخلصانہ اور خصوصی تعاون کیلئے شکر گزار ہیں۔

امید ہے کہ آئندہ بھی اسی طرح آپ کا تعاون اور سرپرستی ہمیں حاصل رہے گی۔

پروفیسر محمد انورالدین

پروفیسر عتیق اللہ

شعبہ اُردو، دہلی یونیورسٹی

۱/۱۱/۲۰۰۴

برادرم فرید صاحب، السلام علیکم!

اس اُمید کے ساتھ آپ بخیر ہوں گے۔

آخری لمحوں میں جب سامانِ سفر باندھ رہا تھا، میں آپ کا بڑی بے تابی سے منتظر تھا۔ آپ سے بہت سرسری سی ملاقاتیں رہیں اور ملاقاتیں بھی کچھ بھاگ دوڑ اور کچھ آپ کی طبیعت کی ناسازی کی نذر ہو گئیں۔ ویسے خدا نے آپ کو جو قد و قامت اور جو ماشاءاللہ خوب روئی عطا کی ہے اسے دیکھ کر یہ شائبہ بھی نہیں ہوتا کہ آپ کسی عارضے میں مبتلا ہونگے۔ ان ملاقاتوں نے آپ کو میرے بہت نزدیک کردیا۔ میرے چھوٹے بھائی کا نام بھی فرید ہی ہے۔ دوسرے آپ کو یہ گمان ہے کہ ''فرید نامہ'' آپ نے مجھے ارسال کی تھی۔ بھائی یہ تو میرے لئے حیرت نامہ کا حکم رکھتا ہے۔ یقین جانیے آپ کی رباعیوں نے میری روح کی گہرائیوں میں جیسے جگہ بنالی ہو۔ میں نے فرید نامے کو ایک بار نہیں چار پانچ بار پڑھا اور ہر بار پھر از سر نو پڑھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ آپ کی رباعی کیا ہے، سرتا پیر

داخلی کلامی ہے جیسے کوئی آواز قلب گاہ کی گہرائیوں سے نمو پا رہی ہو۔ رباعی کو آپ نے ایک نئی دھج عطا کی ہے۔ مجھے جوش اور فراق کی رباعیاں بڑی پسند ہیں۔ سمجھتا تھا کہ اس صنف کا انہیں پر خاتمہ ہے لیکن آپ نے رباعی کو مابعد الطبیعاتی کیفیتوں سے جوڑ کر انہیں اس صنف کی نمویابی پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے۔

میں علیحدہ سے انہیں باتوں کو elaborate کر کے لکھوں گا۔ فی الوقت یہ جذبے تازہ تھے اس لئے انہیں رقم کرنا اور آپ تک پہنچانا ضروری سمجھا۔ بیگم کو دعا کہیئے۔

پروفیسر عتیق اللہ

پروفیسر ابوالکلام قاسمی

علی گڑھ

برادر عزیز ڈاکٹر فرید پربتی صاحب!

سلام مسنون

عرصے کے بعد آپ کا محبت نامہ ملا۔ یادآوری کیلئے کلمات تشکر۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ آزمائش کے مرحلے سے گزر کر خیر و عافیت شعبہ اردو کا حصہ بن گئے۔ غالب کا ایک شعر ہے۔

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب — خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیئے

آپ نے ''شاعری کی تنقید'' کے مضامین پڑھنے کا ذکر کیا ہے۔ اپنی صحیح رائے اس پر ضرور لکھیں۔ مجھے اپنے بزرگوں کے ساتھ خرد ادیبوں کی رائے سے بھی مدد ملتی ہے۔ ویسے آپ کی ذہنی اور ادبی تربیت کا ارتقاء چونکہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اس لئے آپ کے ذوق پر اعتماد رہتا ہے۔

رفقائے شعبہ سے سلام کہہ دیں۔

خدا کرے آپ ہر طرح بعافیت ہوں۔

آپ کا

پروفیسر ابوالکلام قاسمی

رؤف خیر

۱

(حیدر آباد)

۲۷ مارچ ۱۹۹۸ء

فرید بھائی السلام علیکم

آتے ہی مکروہاتِ دنیوی نے گھیر لیا تھا۔ آج توفیق ہوئی تو آپ سے باتیں کرنے بیٹھ گیا۔ ٹرین سے کالج جاتے ہوئے خط لکھ رہا ہوں۔ بد خطی کی معذرت چاہتا ہوں۔

امجد کی نظموں کی زیراکس انشاء اللہ اگلے خط میں بھیجوں گا۔ فی الحال تلاش کیلئے وقت نہ نکال سکا۔

جموں میں آپ کے ساتھ گذرے ہوئے چند لمحات قیمتی رہے۔ انشاء اللہ آپ تو واقعی فرد فرید نکلے۔

ہاں اقبال کے فارسی قطعات ''لالۂ طور'' کے تراجم ضرور بھیجئے گا۔ کتاب ممکن ہو تو بک پوسٹ کر دیجئے مجھے مل جائے گی۔ میں اگلے ہفتے اپنے تراجم یہاں اک محفل میں سنانے والا ہوں۔ ویسے مختلف رسائل کو بھیج دیئے ہیں۔ چھپ جائیں گے اور آپ کے مطالعے میں آئیں تو رائے ضرور دیجئے گا۔

آپ کی اپنی کتاب چھپ کر آ گئی ہوگی۔ نہ آئی ہو (کسی وجہ سے) تو کم از کم سلطان الحق شہیدی (شاعر کا نام شاید یہی آپ نے بتایا تھا) کے تراجم فی الوقت بھیج کر ممنوں فرمایئے مجھے اپنے آپ کو چیک کرنے میں سہولت ہوگی۔

بھائی سے سلام کہئے گا اور کبھی حیدر آباد آنے کا قصد ہو تو غریب خانہ حاضر ہے۔ غریب خانہ اسم بامسمیٰ ضرور ہے مگر دو چار دن آپ کی مسافرت میں خدمت کر کے عزت تو حاصل کر سکتا ہے۔

ان دنوں ۴۱ ڈگری گرمی چل رہی ہے۔ واپسی کے دو دن بعد میرا حال موسموں کی تبدیلی کی وجہ سے شاید ناساز رہا۔ اب الحمدللہ خیریت سے ہوں۔ اللہ کرے آپ بخیر ہوں۔

تراجم کا منتظر

آپ کا اپنا
رؤف خیر

۲

گولکنڈہ حیدرآباد

۲۸/اپریل ۱۹۹۸ء

فرید بھائی السلام علیکم

آپ کی طرف سے ''اثبات'' کا تحفہ پا کر جی خوش ہو گیا۔ کتابت میں جناب خوشنود نے کمپیوٹر کی خوشنویسی کو مات دے دی ہے۔ مشین اور انسان پہلو بہ پہلو کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔

حیرت تو اس بات پر ہے کہ آپ جیسا کمسن فنکار رباعی جیسی پختہ صنف پر ریجھ گیا اور رباعی کے اوزان پر آپ کی گرفت کا اعتراف تو شمس الرحمٰن فاروقی صاحب جیسے ماہر عروض نے کیا۔

عفیف پرنٹرس نے بہت خوبصورت انداز میں یہ کتاب شائع کی ہے۔ البتہ خوشنویسی نے اپنی روایت برقرار رکھی۔ کتابت کی بہت غلطیاں ہیں۔ مصرعوں کے مصرعے بے بحر کر کے رکھ دیئے ہیں۔ صفحہ ۳۹ کے فارسی شعر میں بھی مصرعے میں ایک ایک غلطی ہے۔......

عاقل ز ہست گوید و عارف زنیستی (کتابت میں = گوئید)
من درمیانِ آب و گل ہست و نیستم (ہست = ہستم ہوگیا)

البتہ بعض رباعیات، رباعی کے مخصوص وزن سے ہٹی ہوئی ہیں جیسے صفحات ۸۶ و ۸۷

منزل ہے دور شام ہے محو سفر ہوں
لیکن یہی نہیں زیست کا یہ معرکہ سر ہوں
اس رہ میں مسافر کے تعاقب میں ملیں گے
جلتے ہوئے منظر ہوں کہ بے سایہ شجر ہوں

بے آب کبھی ہجر کی شمشیر بھی ہوگی
پیدا کہ ہر اک نالے میں تاثیر بھی ہوگی
اک دن کہ تفاوت کی یہ دیوار گرے گی
شرمندہ اس اک خواب کی تابیر بھی ہوگی

(صفحہ ۸۶)

آپ نے سرمد، قلی قطب شاہ اور ملا طاہر غنی کے اشعار سے خوب استفادہ کیا ہے اوران کے اشعار پر بڑی لکیر کھینچی ہے۔

رباعی جیسے مشکل فن میں آپ نے ''اثبات'' دے کر اپنی خلاقی کا ثبوت دیا ہے۔ کہیں کہیں آپ نے قوافی میں اجتہاد فرمایا ہے چونک میاں، پھونک میاں اور جونک میاں میں رباعی کے ایسے قوافی ہیں جو ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ حالانکہ قافیہ اعراب ہی سے بنتا ہے۔

یہ اچھا کیا کہ آپ نے اس موجودہ مجموعے میں دلچسپی کے مزید سامان رکھ دیئے یعنی آپ کی غزلیں بہت بھرپور ہیں۔

ممنوں ہوں کہ آپ نے مجھے اپنی محبت سے نوازا۔ ازراہِ خلوص میں نے چند کلمات لکھ دیئے ہیں تبصرہ انشاءاللہ عنقریب کروں گا۔

آپ کا اپنا
رؤف خیر

۳

حیدرآباد

۲۰رمئی ۱۹۹۸ء

محترم ڈاکٹر فرید صاحب

السلام علیکم

یہ جان کر بیحد دکھ ہوا کہ آپ کے سر سے والد کا سایہ اُٹھ گیا۔ ''بے سا یگی'' کا دکھ تو میں بھی برسوں سے جھیل رہا ہوں۔ ''شہداب'' آپ کے پاس ہے۔ اس میں دو نظمیں ضرور پڑھیے اور داد دیجیے ''ابن بے اثاثہ''......اور...... ''ماں/باپ کی قبر پر'' بہر حال مجھے اپنے غم میں شریک ہی سمجھئے۔

''اثبات'' پر تبصرہ کر دیا ہے۔ ایک کاپی آپ کو بھیج رہا ہوں۔ آپ ''شیرازہ'' اور دیگر اخبارات میں شائع فرمالیں یا پھر اگر آپ کہیں تو میں یہاں سے ''شیرازہ'' کو یہ تبصرہ پوسٹ کر دوں گا مگر اس سے پہلے یہاں کے مشہور روزنامہ ''سیاست'' میں بھی اسے انشاء اللہ چھپوادوں گا۔ ممکن ہو تو اک نسخہ ''اثبات'' اور بھیج دیجئے۔ عموما جس ادارے میں تبصرہ دیا جاتا ہے وہ لوگ کتاب بھی مانگتے ہیں۔

تبصرہ امید کہ آپ پسند فرمائیں گے ''مدلل مداحی'' نہ لگے اس خیال سے بعض ضروری فروگذاشتوں کی نشاندہی بھی کر دی ہے۔ اگر میرے معروضات غلط ہیں تو اسی بہانے کم از کم ''اثبات'' پر گفتگو ہوتی رہے گی۔

آپ کے بھیجے ہوئے سلطان الحق شہیدی صاحب کے ترجمے (لالۂ طور۔ از پیام مشرق) ملے ان ترجموں کی سب سے بڑی خوبی تو یہی ہے کہ یہ اقبال ہی کی بحر میں ہیں بلکہ رباعیات ہی کی طرح ہیں یعنی پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعوں میں قافیہ وردیف کی ہم آہنگی کا التزام رکھا گیا ہے۔

اُن کا اک ترجمہ ہے رباعی نمبر ۹

سحری گفت بلبل باغباں را دریں گل جز نہال غم نہ گیرد بہ پیری می رسد خارِ بیاباں ولے چوں گل جواں گردد بمیرد اقبالؔ	صبح کہتی تھی بلبل باغباں سے نہال غم آگے ہیں عاکداں سے ہر اک کانٹے نے لمبی عمر پائی ہے گل دوچار مرگِ ناگہاں سے سلطان الحق شہیدی	کہا مالی سے بلبل نے گجردم نہالِ غم ہی اس مٹی میں پنپا جیا خارِ بیاباں عمر پوری جواں ہوتے ہی گل پژمردہ ٹھیرا رؤف خیرؔ

سلطان الحق کا مصرع ''ہر اک کانٹے نے لمبی عمر پائی'' بہت رواں اور خوبصورت ہے البتہ ''صبح'' کا تلفظ غلط ہے۔ ''صبح'' دراصل ''فع'' کے وزن ہے۔ اور لفظ ''دوچار'' بھی ''فعول'' کے وزن پر آنا چاہیئے۔

بہر حال سلطان الحق شہیدی کے تراجم بڑی حد تک اقبال کے اسلوب سے قریب ہیں انہی کی بحر میں ہیں اور مزہ دیتے ہیں۔

فیض احمد فیضؔ نے بھی بعض تراجم کیئے ہیں۔ فیضؔ کے جو تراجم مجھے ملے ہیں ان کی زیراکس کاپی میں بھیج رہا ہوں۔ تقابلی جائزہ لے کر بتایئے کہ میری محنت مجاہدہ فیضؔ اور شہیدی کے بالمقابل کہاں تک کامیاب ہے۔ بلکہ اگر آپ میرے تراجم کے ساتھ، فیضؔ، سلطان الحق شہیدی اور مضطر مجاز کے تراجم کا تقابلی جائزہ کے عنوان سے کوئی مضمون ہی لکھ دیں تو بڑا مزہ آجائے۔ اگر آپ پسند فرمائیں تو مضطر صاحب کے چند تراجم بھیج دوں۔ اک اچھا مضمون ہو جائے گا۔ آپ بلا کم و کاست کھل کر لکھیئے اگر مجھ سے کہیں کوئی جھول رہ گیا ہو تو اس کی نشاندہی بھی کر دیجیئے تاکہ میری اصلاح ہو سکے۔

مجھے یہ تراجم اپنی طبع زاد تخلیقات ہی کی طرح عزیز ہیں۔ میری بڑی خواہش ہے کہ یہ تراجم کتابی صورت میں آجائیں۔ میں نے یہ تمام ۱۶۳ رقطعات کا ترجمہ بہت محنت سے کیا ہے۔ اور ''قنطار'' کے عنوان سے مسودہ اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش میں داخل بھی کر دیا ہے۔ تاخیر سے داخل کرنے کی وجہ سے اعانت میں پس وپیش کیئے جانے کا اندیشہ ہے بصورتِ دیگر میں اپنے طور پر شائع کروانے کی پوری

پوری کوشش کروں گا۔

چند تراجم بھیج رہا ہوں۔ فیض نے جو تراجم کیئے ہیں ان کے بالمقابل اپنے تراجم بھی لکھ دیئے ہیں۔ اگر سلطان الحق شہیدی کے تراجم بھی (ان قطعات کے) مل جائیں تو تقابل کر کے دیکھ لیجئے۔

امید کہ خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہے گا۔

''جموں'' میں صرف ''شہداب'' آپ کی نذر کر سکا تھا۔ اب ''خطِ خیر'' پوسٹ کر رہا ہوں ملتے ہی رسید سے نوازیئے گا۔ اور اگر کتاب بولے تو اس پر کوئی تبصرہ کر کے کسی رسالے کو یا ''شیرازہ'' ہی کو دے دیجئے۔

بھابی جان کی خدمت میں سلام پہنچا دیجئے گا۔

آپ کا اپنا
رؤف خیر

پروفیسر عتیق احمد صدیقی

علی گڑھ

۱۵ مارچ ۱۹۹۹ء

مجی فرید پربتی صاحب۔ السلام علیکم

جہاز کا سفر ''اثبات'' کے وسیلے سے خوشگوار کٹ گیا۔ جہاز بلندیوں پر پرواز کر رہا تھا اور میں رباعیوں کے طفیل خیالات کی بلندیوں کی سیر کر رہا تھا۔ بعض رباعیوں کو ٹھہر ٹھہر کر دو دو تین تین بار پڑھا (آپ سے یہ رباعیاں سنی ہوتیں تو بھی انہیں مکرر سہ مکرر پڑھوایا جاتا) اور لطف اندوز ہوا مثلاً ؎

نادیدہ مقاموں پہ ٹھہرنا بھی پڑا   پر ہول مناظر سے گزرنا بھی پڑا
جینا بھی پڑا، ہاں مجھے مرنا بھی پڑا   اے روشنی جاں تجھے پانے کیلئے

عاقل یہ کہتا ہے کہ ہستی ہوں میں
ان دونوں سے ماورا ہے دنیا میری

عارف یہ کہتا ہے کہ پستی ہوں میں
جوان سے نہ بس سکی وہ بستی ہوں میں

اڑتے ہوئے لمحات کی گردش اور میں
رفتار ہے کج پائے طلب کی شاید

موہوم خیالات کی لرزش اور میں
بے سود شب و روز کی ورزش اور میں

یا غزل کے یہ اشعار ؎

آنکھوں کی پتلیوں میں مقید ہے کائنات
لیکن فشار ذات سے محرم نہیں ہوا

وہ موجۂ گلاب جو گلشن میں کھو گئی
ممکن ہے زیر سایہ گیسو نکل پڑے

اب نہ حریم ناز سے ہوگا طلوب آفتاب
قرب جمال تو گیا لطف وصال اب نہیں

اور ایسی ہی بہت سی رباعیاں اور غزل کے بہت سے اشعار لطف اندوز کرتے رہے۔ سبحان اللہ، مرحبا کے کلمات بار بار زبان پر آئے۔ اچھی اٹھان ہے۔ خدا کرے آپ فن کی اعلیٰ تر منازل تک پہنچیں اور ادب میں ایسا مقام پیدا کرلیں جو جاودانیت کا حامل ہو۔

مخلص
عتیق احمد صدیقی

مدیر اعلیٰ ''ذہن جدید'' **زبیر رضوی**

۲۱ر اکتوبر ۲۰۰۵
دہلی

مکرمی ڈاکٹر فرید پربتی صاحب

تسلیم

آپ کا تازہ شعری مجموعہ ''گفتگو چاند سے'' موصول ہوا۔ اس خوبصورت شعری تحفے کے لئے میں آپ کا ممنون ہوں۔

آپ کا کلام رسائل میں توجہ سے پڑھتا رہا ہوں اور اسکے محاسن کی داد بھی دیتا رہا ہوں۔ آپ کے بعض شعر تو اس مجموعے کے میرے مطالعے میں آنے سے

پہلے مجھ تک پہنچ گئے تھے جیسے یہ شعر

•

کون آتا ہے میری راتوں کو کرنے معتبر
کون جاتا ہے میری شمعیں دھوں کرتا ہوا

•

خود ہی رکھتا ہے دیئے تیز ہوا کی زد پر
اور آندھی سے خبردار جی کر دیتا ہے

•

مرے چراغ کو طاقِ زیاں پہ رکھتا ہے
جہاں اندھیرا نہیں ہے وہاں پہ رکھتا ہے

•

امید ہے اس مجموعے کی اشاعت سے آپ سرشار ہونگے اور احباب سے اپنے اچھے شعروں کی داد لے رہے ہونگے!

مخلص

زبیر رضوی

اے عارج

۱۲۳۱۔جین محلّہ

روپر

۲۲رجون ۱۹۹۳ء

محبی فرید صاحب دعا

۲رجون کا خط مع دو مجموعات آبِ نیساں اور انتخاب کلام شہ زور کاشمیری گزشتہ ہفتہ موصول ہوا۔ عمدہ کاغذ، عمدہ کتابت، عمدہ چھپائی، عمدہ ٹائٹل اور گرد پوش آپ کی ذہانت، مذاق اور نفاست کا آئینہ ہے پیکٹ کھولنے پر طبیعت بہت خوش ہوئی اور بیساختہ تحسین کا کلمہ زبان پر آ گیا۔ آبِ نیساں کی ورق گردانی سے

آپ کی علمیت اور مشق کا اندازہ ہوا اور خوشی ہوئی۔ صحیح اور مکمل رائے مطالعہ کے بعد سپرد قلم کروں گا۔

آپ کی مشق کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے پہلی قسط میں فن اصلاح پر دو کتابیں ''میری اصلاحیں'' معہ اول اور دوم بذریعہ رجسٹری ارسال کر رہا ہوں۔ آپ مطالعہ کے بعد انہیں بذریعہ رجسٹری ہی واپس بھجوایئے۔ عام ڈاک سے نہیں کیونکہ گم ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے اور کتابیں نایاب ہیں۔

آپ نے اپنے ۲/جون کے خط میں اور پیکٹ کے کوڈ پر بھجوائی کتابوں کی تعداد اور نام نہیں لکھے اور اسے عام ڈاک سے بھجوا دیا۔ کتابوں کے ڈاک کی نذر ہونے کے خطرہ کے پیش نظر رجسٹری سے بھیجنا ہی مناسب ہے۔

آپ کی طرف سے ہنوز کوئی رسالہ موصول نہیں ہوا۔ اطلاعاً تحریر ہے۔

دونوں کتابوں کی پہنچ سے فوراً مطلع کیجیے۔ اگلی قسط میں کچھ اور کارآمد کتابیں ارسال کروں گا۔

باقی والسلام

عارج روپ نگری

عبدالاحد ساز

بمبئی

۱۵/دسمبر ۲۰۰۳ء

محترم فرید پربتی صاحب

السلام علیکم

''فرید نامہ'' کی بامعنی و خوبصورت سوغات کیلئے ممنون ہوں۔ آپ کی تخلیقات رسائل میں تو بارہا پڑھی ہیں اور آپ کی پختہ کلامی کا بھی قائل ہوں۔ رباعیات یقیناً سرشار کر رہی ہیں۔ معنوی اعتبار سے بھی اور مصرعہ آرائی اور دروبست کی رو سے بھی۔ خصوصاً ایسے میں جبکہ تلاثی، ماہیے، ہائیکوز وغیرہ کے نام

پر سہل نگاری کے دریا بہائے جا رہے ہیں، ہماری ایک توانا، موقر، عروض و اوزان کی فہم، اور زبان و بیان پر دسترس کا تقاضہ رکھنے والی صنفِ سخن رُباعی کو اختیار کرنا اور حتی المقدور اس کا حق ادا کرنا بڑی قابلِ استحسان بات ہے۔ مری جانب سے فرید نامہ کی اشاعت پر دلی مبارک باد قبول کیجئے۔ کتاب صوری طور پر بھی بیحد خوبصورت چھپی ہے۔ حقانی القاسمی کی پس نوشت اور کرشن کمار طور کی مختصر رائے بہت پسند آئی۔

خدا اس مرقعِ سخن کو حلقہ ہائے ادب میں شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔

مخلص

عبدالاحد ساز

پریم کمار نظر

۱

ہوشیار پور

۱۹ر مئی ۱۹۸۸ء

عزیز من۔ خوش رہو!

یار تم تو ابھی کم عمر ہی ہو یعنی میرے بڑے لڑکے سے صرف ۴ سال بڑے ہو۔ یہ عمر اور یہ اُٹھان۔ ریاست جموں و کشمیر کے جدید تر شعراء کی نسل کے تم ''میر کارواں'' ہو۔ تمہاری پیاری پیاری بھولی بھولی شخصیت کی طرح تمہارا کلام بھی پاک وصاف ہے۔

تمہاری کتاب مل گئی ہے۔ اسے پڑھ لوں تو اپنی تفصیلی رائے سے آگاہ کروں۔ ویسے تمہارے گھر میں تمہاری ہی زبانی چند غزلیں سنی تھیں، وہ ابھی تک ذہن میں محفوظ ہیں۔

دیکھوں اس سال سرینگر آتا ہوں کہ نہیں گھر میں سبھی کی خدمت میں آداب۔

پریم کمار نظر

۲

ہوشیار پور

۲۷ / دسمبر ۱۹۹۱ء

برادرِ عزیز و محترم۔ آداب!

''آبِ نیساں'' مل گئی ہے۔ پڑھ رہا ہوں اور لطف اندوز ہوتا ہوں۔ میں اُن میں سے نہیں ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ آپ کی کتاب ملی اور ایک نشست میں ختم کردی۔ بھائی لوگو شاعری شاعری ہے۔ اگر شعر ہوں تو دن میں دو چار ہی پڑھ لئے جائیں تو غنیمت ہے۔ خیر!

میں آپ کے کلام کو ہمیشہ سے پسند کرتا آیا ہوں۔ اس میں مجھے اُسی تازگی کا احساس ہوتا ہے جو آپ جیسے نوجوان کا شعور اور ذی ہوش شاعر کے کلام سے ہونا چاہئے۔ آپ کے ہاں تو یہ منظر عام ہوتا ہے جب برف پر تیز دھوپ پڑتی ہے اور اس میں سے دھواں سا اُٹھتا ہے جسے ہم برف کے سلگنے کا نام بھی دے سکتے ہیں اور اُس دھویں کا بھی جس کا پتہ نہیں چلتا کہ دل سے اٹھتا ہے یا جاں سے۔ آپ کے اشعار کی عین یہی کیفیت ہے۔

میں آپ کی اس روش پر بہت خوش ہوتا ہوں کہ آپ اردو شاعری کی نئی نئی منزلیں طے کرتے جا رہے ہیں۔

آپ لوگوں سے ملاقاتیں تو اب خواب و خیال ہو کر رہ گئی ہیں۔ دیکھیں وہ دن کب ہوتا ہے جب پھر وادیٔ گل میں جانا ہو اور اس کی عطر بیز خوشبوؤں کی رفاقت میسر آئے۔

سرینگر کے دوستوں کو بے شمار خط لکھے لیکن کوئی جواب ہی نہیں دیتا۔ اب آپ کی وساطت سے اُن کی خیریت معلوم کرنے کی سعی نکالتا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اس سے قبل بھی آپ کو ایک خط لکھا تھا جس میں دوستوں کی طرف سے خطوط کا جواب نہ ملنے کی شکایت تھی۔ اب آپ ہی میرے لئے تکلیف گوارا کریں اور حضرت مظفر ایرج اور حکیم منظور کے پاس جائیں اور اُن سے خیریت نامے لکھوا کر مجھے پوسٹ کریں۔ اگر محترمہ رخسانہ جبیں بھی ملیں تو اُنہیں بھی میرا آداب کہہ دیں۔

پچھلے دنوں جموں ریڈیو کا مشاعرہ تھا اور مجھے بھی دعوت تھی لیکن میں خانگی مصروفیات کی وجہ سے نہ جاسکا۔ ہوسکتا تھا کہ وہاں دوستوں سے ملاقات ہوتی۔

سرینگر کی زیارت میرے لئے ہمیشہ باعث مسرت وافتخار رہی ہے وہاں جتنی بار بھی گیا ہوں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ایک ایسی دنیا میں آ گیا ہوں جہاں سے شاید صدیوں سے بچھڑا تھا۔

کبھی کبھار خط لکھتے رہا کریں۔

پریم کمار نظر

ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی

بھٹکل کرناٹک

۱۸ نومبر ۲۰۰۳ء

برادرم ڈاکٹر فرید پربتی صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ

گرامی نامہ مورخہ ۲۶/اکتوبر (مع فرید نامہ) موصول ہوا۔ اس کرم فرمائی کا بے حد شکریہ! آپ کی دلکش تصویر سے آراستہ خوبصورت کتاب دیکھ کر دہلی میں آپ کے ساتھ گذارے ہوئے قیمتی لمحات کی بہت سی پر خلوص یادیں تازہ ہوگئیں۔ واقعی میرے لئے تو اس ریفریشر کورس کی اصل یافت آپ کی بہترین

دوستی ہے۔آپ جیسے نہایت حساس شاعر، جذباتی انسان، یار باش، دوست نواز، عاشق مزاج، آئینہ کی طرح شفاف دل، خلوص و محبت کے پیکر دوست کو پاکر کسے خوشی نہ ہوگی۔

تمام اصناف شاعری میں رباعی گوئی کو میں سب سے مشکل صنف مانتا ہوں۔ یہ دریا کو کوزہ میں بند کرنے یا چاول پہ قل ھواللہ لکھنے کا فن ہے اور یہ کمالِ فن، کل ہمارے امجد حیدر آبادی کے ہاتھ میں تھا تو آج فرید پربتی (کاشمیری) کی دسترس میں ہے۔آپ کی رباعیات پر بڑا اچھا تبصرہ برادرم حقانی القاسمی نے کیا ہے، میں ان کے حرف حرف سے متفق ہوں۔آپ کے کلام میں تصوف کی چاشنی، پند و نصائح اور اخلاقی مضامین کی فراوانی کبھی فریدالدین عطار تو کبھی سعدی، کبھی رومی کی یاد دلاتی ہے اور اس معاملہ میں آپ میرے ہم مسلک اور ہم مشرب نظر آتے ہیں، سرمد کا میں بھی قائل ہوں اور آپ کی نظم مزار سرمد پر پڑھنا چاہتا ہوں جس کا ذکر قاسمی نے تفصیل سے کیا ہے۔کبھی ممکن ہو تو اس کی فوٹو کاپی بھجوایئے۔

پرسان حال کو سلام کہہ دیں۔ والسلام

خیر طلب

ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی

ڈاکٹر شہپر رسول

جامعہ نگر نئی دہلی

مخلص و محترم پیارے فرید!

اسعد کی بے وقت جدائی نے ہلا کر رکھ دیا۔ ابھی تک یقین نہیں آتا کہ ایسا ہو گیا ہے۔شعبہ اردو میں تعزیتی جلسہ ہوا لیکن میں ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔

اسعد کی بیگم کو خط تک نہ لکھ سکا۔کیا لکھوں، کیسے لکھوں؟؟ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔اس کا غم تو وہی سمجھ سکتی ہیں۔

سہ ماہی ''لمحے لمحے'' بدایوں والے نمبر نکالنا چاہتے ہیں۔ ان کو بھی مضمون

لکھئے وہ آپ کو خط لکھیں گے۔

ہمدم کاشمیری صاحب کا شعری مجموعہ ''دھوپ لہو کی'' موصول ہوا۔ اچھا مجموعہ ہے۔ میں نے اپنے تاثرات اور رسید کے طور خط لکھ کر آپ کے خط کے ساتھ رکھ دیا ہے۔ یقیناً ان تک پہنچ جائے گا۔

آپ کی بیگم اب کیسی ہیں؟ خدا کرے کہ بہتر ہوں۔ ان سے ملاقات نہ ہو سکی اس کا افسوس ہے۔

جواب کا انتظار رہے گا۔

ڈاکٹر شہپر رسول

منظور ہاشمی

(۱)

علی گڑھ

یکم اکتوبر ۲۰۰۳ء

برادرم فرید پربتی

سلام و رحمت

سالِ رواں اکتوبر کے ایوانِ اردو میں آپ کا مقالہ خاکسار کے ایک شعر پر اصلاح پڑھا، حسن محنت، دیدہ ریزی اور کثیر مطالعہ کے بعد لکھا ہے وہ قابل قدر ہے ورنہ آج کل کون اتنی محنت، تلاش اور ریسرچ کرتا ہے، میری دلی مبارکباد، دراصل آپ کو خط لکھنا ہی تھا کہ میرے عزیز دوست شہپر رسول نے فون پر بتایا کہ مرحوم اسعد بدایونی پر آپ بھی مضمون تیار کر رہے ہیں۔ یونیورسٹی میگزین میں اس کا بھرپور گوشہ شائع ہو رہا ہے۔ آٹھ نو مضامین مل چکے ہیں بس شہپر اور آپ کا مضمون مل جائے تو گوشہ بھر جائے۔

آپ سے درخواست ہے کہ ۲۰/اکتوبر تک اپنا مضمون صدر شعبہ اردو ڈاکٹر قیصر جہاں کو بھیج دیں۔ آپ کو مختلف رسائل میں پڑھتا رہتا ہوں مگر نثری مضمون پہلی بار پڑھا اور قائل ہو گیا۔

آپ دلّی آتے رہتے ہیں اگلی بار پروگرام ہو تو مجھے لکھئے گا تو ملاقات کی سبیل نکالوں گا۔ جواب ضرور دیں اور اس میں اپنا فون نمبر بھی لکھیں تو ممنون ہوں گا۔

اللہ آپ سب کو اپنی امان میں رکھے۔

اور سب قابل شکر ہے۔

مخلص

منظور ہاشمی

۲

علی گڑھ

برادرم فرید پربتی، سلام و رحمت

آپ کا محبت اور یادوں بھرا خط ملا۔ آپ نے وقت اور فاصلوں کی دیواروں کو درمیان میں نہیں آنے دیا۔ یہ میری خوش نصیبی اور آپ کی شریف النفسی ہے۔ یوں آپ کا تذکرہ کبھی شہپر سے اور کبھی رئیس الدین رئیس سے اور اسعد مرحوم سے رہتا رہا۔ کبھی کبھی وہ رسالے پڑھے جن میں آپ کی تحریر اور تخلیق شائع ہوئی۔ حامدی کشمیری اور حکیم منظور کے ساتھ آپ کشمیر میں اُردو کے معتبر فنکاروں کی صف میں ہیں۔ خدا آپ کے فن و فکر میں اور جلا بخشے۔

آپ نے اسعد مرحوم کی سپاہیانہ اور باغیانہ طرز ادا کا اپنے مضمون میں بہت بھرپور احاطہ کیا ہے میں اپنی طرف سے صدر شعبہ اردو کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اس میگزین کا اجراء ۲۵رجنوری ۲۰۰۴ء کو ہوگا۔

اور سب حالات قابل شکر ہیں۔

مخلص

منظور ہاشمی

۳

علیگڑھ

۲۰ رنومبر ۲۰۰۳ء

براادرم فریدؔ پربتی

سلام ورحمت

آپ کے مضمون ملنے کی اطلاع پہلے دے چکا ہوں۔ اسعد پر یہ مضمون خصوصی زاویۂ نگاہ سے لکھا ہوا پُر خلوص اور پُر مغز مضمون ہے۔ اس کے شعری رویئے کو سمجھنے میں معاون۔ وسط جنوری میں شائع ہوکر ۲۵ رجنوری کو اجراء ہوگا۔

آپ نے ایک اور عنایت کی۔ اپنی تازہ کتاب ''فریدنامہ'' جو رباعیات پر مشتمل ہے، مجھے بھیج کر اس کے فکر وفن سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیا۔ ابھی تو جستہ جستہ میں پڑھ سکا ہوں لیکن یقین ہے کہ اطمینان سے پڑھوں گا تو کہنا پڑے گا:

کوزے میں سمایا ہوا دریا نکلا!

یہاں سب احباب ٹھیک ہیں۔ حالات بھی ٹھیک چل رہے ہیں۔ والسلام

مخلص

منظور ہاشمی

ڈاکٹر حمید اللہ بٹ

۲۹ر ستمبر ۲۰۰۳ء

مکرمی

تسلیم!

قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام ۶ تا ۱۴ ستمبر ۲۰۰۳ء کے درمیان منعقدہ چوتھے کل ہند اردو کتاب میلے اور اردو اکادمیوں کی چوتھی کانفرنس کو آپ نے اپنی شرکت سے جو وقار اور اعتبار بخشا، اس کیلئے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ میلے میں جہاں بڑی تعداد میں شائقین کتب نے کتابوں کی خریداری کی وہیں مختلف ثقافتی پروگراموں سے بھی وہ لطف اندوز ہوئے۔ ہماری کوشش تھی کہ کتاب میلے میں اردو کلچر کے تمام پہلوؤں کی خاطر خواہ نمائندگی ہو۔ چنانچہ اسی مقصد کے تحت مشاعرے، طلبہ کیلئے انعامی مقابلے، ادیبوں اور اسکالرز سے ملاقاتیں اور دیگر ادبی وثقافتی پروگرام پیش کئے گئے۔

میلے کے دوران ریاستی اردو اکاڈمیوں کی چوتھی کانفرنس کے انعقاد کا اہم مقصد یہ تھا کہ اردو لسانی فرقے کو ملک گیر سطح پر باہم مربوط کیا جائے اور تمام ریاستی اردو اکادمیوں اور کونسل کے باہمی تعاون سے ایک مشترکہ حکمت عملی کے تحت اردو کاز کو آگے بڑھایا جاسکے۔ اس کانفرنس میں جو تجاویز سامنے آئیں، کونسل انہی کی روشنی میں فروغِ اردو کیلئے مستقبل کا لائحہ عمل مرتب کرے گی۔

میں آپ کا ایک بار اور شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے کتاب میلے اور کانفرنس میں نہ صرف شرکت کی بلکہ اسے کامیاب بھی بنایا۔ امید ہے کہ مستقبل میں بھی اپنے پرخلوص تعاون اور رہنمائی سے نوازتے رہیں گے۔

امید کہ آپ بخیر ہوں گے۔

مخلص

ڈاکٹر حمید اللہ بٹ

شہزاد انجم

رام پور

۹ر ستمبر ۲۰۰۳ء

مکرمی فرید پربتی صاحب! سلام و احترام

خدا کرے آپ بخیر و عافیت ہوں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں اُردو ریفریشر کورس کے دوران آپ کے ساتھ ہوئی خوشگوار ملاقات کی خوشبو سے دل و دماغ اب تک معطر ہے۔ آپ کی علمیت، صلاحیت اور شرافت کا میں قائل ہوگیا۔ ادب کے ساتھ آپ کا سچا کمٹ منٹ ہے۔ میں نے یہاں کے شعری حلقوں میں آپ کا ذکر کیا۔ متعدد لوگ آپ سے واقف اور آپ کی شاعری کے معترف ہیں اُن میں سے ایک ڈاکٹر عابد رضا بیدار، سابق ڈائریکٹر خدا بخش خاں لائبریری پٹنہ بھی ایک ہیں۔ ''فرید نامہ'' کی اشاعت پہ مبارکباد قبول فرمائیں۔ اس کتاب کا میں منتظر ہوں۔

اہل خانہ اور احباب کو میرا سلام کہیں۔

خیر اندیش

شہزاد انجم

امیر

امریکہ

۱۸ر دسمبر ۱۹۹۸ء

عالیجناب فرید پربتی صاحب، السلام علیکم

ریڈیو کشمیر پر منعقد مشاعرے میں آپ سے مختصر سا تعارف ہوا۔ آپ نے اپنی کتاب ''اثبات'' عطا فرمائی۔ جس کا تہہ دل سے شکریہ قبول فرمایئے۔

کشمیر کی خوشگوار یادوں کے ساتھ، چند دن ادھر امریکہ لوٹا۔ دورِ قیام موسم کی برودت سے حسن قدرت کا نظارہ تو نہ کر سکا مگر ساکنانِ وادی کے حسن خلوص سے فیضیاب ہوا۔

آپ کی رباعیات بہت پسند آئیں۔ دراصل یہ صنف شاعری میری پسندیدہ ترکیب ہے۔ عمر خیام، سرمد، میر انیس کی رباعیات سے میں نے بھی شروعاتِ تحصیل لسان کی تھی، لکھی بھی، مگر التبعی (قدرت نگاری Natural poets) کی طرف زیادہ رجحان تھا۔ سو نظم اور مقدس کی طرف رخ کیا۔

جلوہ گستر ہے نگاہ و قلب پر اس کا جمال
ڈھونڈتا ہے ساحلِ قرطاس کو سیلِ خیال
ہے قلم کی نوک پر تخلیق کا اک ارتعاش
اور ہنر کو شوق ہے تصویر ہو اک بے مثال

امیر

آپ کو معلوم ہوگا کہ سرمد یہودی تھا۔ اسکی یہ رباعی سنئے:

سرمد ز خلق ہیچ یاری مطلب
از شاخ برہنہ سایہ داری مطلب
عزت نہ قناعت امت و خواری و طمع
باعزت خویش باش خواری مطلب

آپ کی ایک رباعی میں اسی قسم کا خیال آپ نے پیش کیا ہے۔

یہ دیکھ کے خوشی ہوئی کہ اردو زبان کو دہلی، لکھنؤ اور حیدرآباد کے بعد کشمیر میں جائے نجات ملی۔ آپ سب کشمیر کے شعراء اور ادیب اس وقت اس کے علم بردار ہیں۔ ان حضرات کو میرا پر خلوص سلام اور مضمون خط واحد۔

خاکسار
امیر

آزاد گلاٹی

گورنمنٹ کالج نابھ

۲۷/۷/۱۹۹۲ء

برادرم آداب

گذشتہ دِنوں جالندھر ٹی وی کے مشاعرہ کے ریکارڈنگ کے بعد میں ایک شام کیلئے اپنے عزیز دوست پریم کمار نظر کے ساتھ ہوشیار پور گیا تو وہاں کشمیر کے اور دوستوں کا ذکر رہا جو ادب اور خصوصاً شاعری میں قابل قدر مقام رکھتے ہیں۔ نظؔر نے آپ کا ذکر کیا تو میری خواہش یہ ہے کہ آپ سے رابطہ قائم کیا جا سکے تو کیا کہئے! مجھے یاد نہیں کہ ہم کہیں ملے ہیں یا نہیں، اگرچہ میں سرینگر اور جموں کے مشاعروں میں شریک ہوتا رہا۔ آپ کا کلام اِدھر اُدھر رسالوں میں نظر سے گذرتا تو رہا لیکن اس طرح ریزہ ریزہ تاثر اکثر زائل ہو جاتا ہے۔ اب جبکہ نظر صاحب نے آپ کا ذکر اس قدر محبت سے کیا تو میرا جی چاہا کہ نہ صرف آپ جیسے پیارے شخص سے رشتہ، محبت قائم کیا جائے بلکہ برابر رابطہ بن جائے انہوں نے آپ کے کسی مجموعہ کلام کا ذکر بھی کیا لیکن تفصیل سے بات نہ ہوسکی کہ باتوں کا سلسلہ بکھرتا رہا!

اپنے تعارف میں محض یہ عرض کردوں کہ میں گذشتہ ۳۲/برس سے یہاں آل انڈیا اردو ادب سے جنون کی حد تک عشق کرتا ہوں۔ نابھ ایک ''غیر ادبی'' شہر ہے کم از کم اردو کے لحاظ سے، اسلیئے رسالوں اور دوستوں خطوط ہی کے ذریعہ ''ادبی محفلیں'' خود میرے ہی کمرے میں رہتی ہے! ۳۲/برس تک اس کالج میں انگریزی ادب کی تعلیم دینے کے بعد اب اسی ماہ سرکار نے مجھے اسی کالج میں بطور پرنسپل تعینات کردیا ہے ملازمت کا ایک برس باقی ہے۔ اچھا ہے کہ وہ یہیں گذر جائے گا۔

مزید باتیں تو آپ کا خط آنے پر ہوں گی۔ وہاں کے میرے عزیز دوستوں

میں پروفیسر حامدی کاشمیری صاحب، حکیم منظور صاحب اور مظفر ایرج صاحب شامل ہیں۔ حکیم منظور نے ابھی انہی دنوں یاد فرمایا ہے۔ حامدی صاحب کا خط کافی عرصہ سے نہیں آیا۔ ان سے ملاقات ہو تو میرا اسلام کہئے گا۔

کبھی کبھی یاد کرتے رہا کیجیئے۔

مخلص

آزاد گلاٹی

کوثر صدیقی

بھوپال

۱۱ر جنوری ۲۰۰۴ء

محترم جناب ڈاکٹر فرید صاحب۔ سلام ورحمت

''فرید نامہ'' فکر انگیز رباعیات کا تحفہ لیکر پہنچا۔ اس خاص عنایت کیلیئے بہت بہت شکر گزار ہوں۔ آپ کی تخلیق کے اعتراف کیلیئے پروفیسر ظہیر احمد صدیقی اور ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی کی آراستہ ہیں۔

میں اس کتاب پر کاروانِ ادب کے اگلے کسی شمارے میں تبصرہ ضرور شائع کروں گا۔ براہِ کرم ایک مزید جلد کے ساتھ مختصر احوال وکوائف بھی ارسال فرماویں۔

میں بھی آپ کو اپنی حقیر کتاب ''موجِ سبو'' جو رباعیات پر مشتمل ہیں پیش خدمت کر رہا ہوں شاید کسی لائق ہو۔ کاروانِ ادب کا گذشتہ شمارہ بھی منسلک ہے۔

جواب کا انتظار کروں گا۔

والسلام

آپ کا ناچیز

کوثر صدیقی

پریمی رومانی

جموں

۱۰/جون ۱۹۹۳ء

بھائی فرید!

خوش رہو! شہہ زور مرحوم پر تمہاری کتاب پہنچ گئی ہے۔ آج تک تو میں تمہیں صرف ایک شاعر ہی سمجھ بیٹھا تھا۔ کہیں تم نے شہہ زور کے کلام کو مرتب کر کے ایک اچھا محقق ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ خود میں نے بھی شہہ زور صاحب کی حیات میں ایک ایسے ہی کام کی شروعات کی تھی لیکن اُس زمانے میں مرحوم گوشہ نشینی اختیار کر چکے تھے۔ لہٰذا مایوس ہو کر میں نے اس کام کو نامکمل چھوڑ دیا۔ تم اس لئے مبارکباد کے مستحق ہو کہ تم مرحوم کا کلام اور سوانحی اشارے جمع کرنے میں کامیاب ہو گئے ہو۔ آگے جو بھی مرحوم شہہ زور پر کام کرے گا اُس کیلئے تم نے راہیں ہموار کی ہیں۔ میری اور سے ایک اور بار مبارکباد۔

تمہارا بھائی........ پریمی رومانی

عالم خورشید

پٹنہ

۲۶/جولائی ۱۹۹۳ء

برادر سلام و محبت

'شاعر' کے تازہ شمارے میں آپ کی چار غزلیں مطالعہ سے گذریں۔ آپ کے لہجے میں بڑی شائستگی اور سنجیدگی ہے جو ہماری نسل کے شعراء میں کمیاب ہے۔ آپ کی غزلیں پڑھ کر آپ سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ان خوبصورت غزلوں کیلئے مبارکباد قبول کریں۔ دُعا گو ہوں آپ اسی طرح

اپنے شعری سفر میں رواں دواں رہیں۔

اتفاق سے ان دنوں آپ کے ذریعہ مرتب کیا ہوا شہہ زور کاشمیری کے کلام کا انتخاب زیر مطالعہ ہے۔

آپ کا مجموعہ کلام کب منظر عام پر آ رہا ہے؟ عنقریب میں کن کن رسائل میں آپ کا کلام شائع ہونے والا ہے؟

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ احباب کو سلام کہیں۔

احقر

عالم خورشید

طھور منگوری نگاہ

ریوا

یکم مارچ ۲۰۰۶ء

محترم جناب فرید پربتی صاحب

سلام ورحمت

نوازش نامہ مرقومہ ۱۶ر فروری موصول ہو کر باعث مسرت ہوا۔ ''گلابوں کے چراغ'' پر آپ کے تاثرات سے شرمندہ، شرمندہ سا ہوں آپ جیسے صاحب علم ونظر سے ایسی حوصلہ افزا پذیرائی میری خوش قسمتی کی دلیل ہی کہی جائے گی۔ آپ مجھے ادبی گفتگو میں یاد فرماتے رہتے ہیں اسے آپ کی اعلیٰ ظرفی اور ذرہ نوازی ہی کہا جاسکتا ہے۔ میرے حقیر سے مجموعہ رباعیات کو آپ نے جس عمیق مطالعے سے نوازا ہے اور جس طرح اسکے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے میرے لئے کسی انعام سے کم نہیں ہے۔ ابھی دسمبر ۲۰۰۵ء میں ہی آپ پر ماہنامہ شاعر میں جو گوشہ شائع ہوا ہے وہ میرے مطالعے میں رہا ہے آپ کی ناقدانہ بصیرت اور شاعرانہ صلاحیتوں کا دل سے معترف ہوں۔ خصوصاً فن رباعی گوئی پر آپکی گہری

نظر اور تخلیقی تنوع سے مجھ ہیچداں کو نہ صرف تخلیقی ترغیب ہی ملتی ہے بلکہ میری رہنمائی بھی ہوئی ہے۔ جناب میں ہندوستان کے ایک ایسے خطے میں پڑا ہوا ہوں جہاں اردو جاننے والے بس گنتی کے چند لوگ ہیں اور ادبی ذوق تو تقریباً ناپید ہے۔ بس ادبی رسائل اور کتب جو دستیاب ہو جاتی ہیں انہیں سے میرے ذوق کی آبیاری اور کچھ ٹوٹا پھوٹا کہہ لینے کا سامان مہیا ہوتا ہے۔ آپ نے ''صادقین'' پر اپنے گرانقدر مضمون کا ذکر فرمایا ہے بدقسمتی سے یہ مضمون مجھ تک نہیں پہنچ سکا اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو اس کی زیراکس عنایت فرمائیں۔ ممنون ہوں گا۔

آپ نے ''گلابوں کے چراغ'' پر تفصیل سے لکھنے کا ارادہ ظاہر فرمایا ہے۔ مجھے شدت سے انتظار رہے گا۔ شکریہ۔ امید کہ مع جملہ متعلقین مع الخیر ہوں گے۔

نیازمند

طہور منصوری نگاہؔ

انتخاب

مضامین

اور

کلام

اُردو رباعی پر ایک نظر

فرید پربتی

اس میں دو رائے نہیں کہ غزل اُردو شاعری کی مقبول ترین صنف ہے۔ یہ کہ فنِ رباعی کی تفہیم آج تک کسی ثقہ صاحبِ فن کے ذریعے سے نہیں ہوئی ہے۔ باوجود یہ کہ رباعی کے آثار ہمارے ادب میں ابتداء ہی سے پائے جاتے ہیں۔ دویم رُباعی کا فن کافی ریاض طلب ہے اور ہمارے تخلیق کار دقتوں کا سامنا کرنے سے ہمیشہ جی چراتے ہیں۔ سویم غزل کا جادو اِس طرح سروں پر چڑھ کر بول رہا ہے کہ باقی اصناف پر پسماندگی کی گرد چڑھ گئی ہے۔

رباعی ایرانی الاصل (عجمی) صنف ہے۔ اس کی ایجاد کا سہرا ایرانی شعراء کے سر جاتا ہے۔ فٹز جیرالڈ (Eward Fitz Gerald) کے عمر خیام کی رباعیوں کے ترجمے سے رباعیوں کا لفظ دنیا کی ہر زبان میں پہنچ گیا۔ اُردو ادب میں رباعی نے اپنا چراغ فارسی رباعی سے روشن کیا ہے۔

رباعی صنفِ نظم میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں اختصار کے ساتھ جامعیت کی جو صفت نظر آتی ہے وہ دیگر اصناف میں مفقود ہے۔ رباعی مختصر صنف ہے۔ جس میں مقررہ اوزان، وحدتِ فکر اور تسلسل بیان کی پابندی از حد ضروری ہے۔ یہ صنف دیر تک متنازعہ فیہ رہی ہے۔ اکثر تذکروں میں یہ بات دہرائی جاتی ہے کہ ''یعقوب صفار کا ایک کم سن بچہ ایک دن اخروٹوں سے کھیل رہا تھا۔ ایک

اخروٹ لڑھکتے لڑھکتے ایک گڈھے میں جا گرا۔ بچے کی زبان سے بے ساختہ یہ مصرع نکلا

غلطاں غلطاں ہمی رود تا لبِ گو

یعقوب صفار بھی موجود تھا۔ اسے بچے کی زبان سے یہ موزوں کلام پسند آیا۔ چونکہ اس وقت تک اس بحر میں اشعار نہیں کہے جاتے تھے۔ شعراء کو بُلا کر کہا کہ یہ کیا بحر ہے؟ انہوں نے کہا ہزج ہے۔ پھر تین مصرعے اور لگا کر رباعی کر دیا اور دو بیتی نام رکھا۔ مدت تک یہی نام رہا۔ پھر دو بیتی کے بجائے رُباعی کہنے لگے۔

موجودہ تحقیق کی روشنی میں رباعی کے شخصی ایجاد ہونے کی تردید کی جاتی ہے۔ محققین کی فہرست میں پروفیسر پرویز ناتل خانلری کا نام سرفہرست آتا ہے۔ ڈاکٹر خانلری کی رائے ہے:

''ایں نوع شعراء ز مدت ہا قبل در ایران شائع و رائج بود۔ واز ہمیں حکایات چنیں بر باید کہ ایں وزن اختراع شدہ بلکہ از تودۂ مردم فارسی زبان اقتباس کردہ''

رُباعی دراصل شخصی ایجاد نہیں بلکہ یہ لوک گیت کی نہایت قدیم صنف ہے۔ جو ترقی کر کے اعلیٰ شاعری کی صنف بن گئی ہے۔ اصل میں قدیم ایران میں ترانہ ایک صنف کی حیثیت سے رائج تھی۔ اس کا وجود ایرانی شاعری میں نورِ اسلام سے قبل بھی ملتا ہے۔ اس سے اس کے شخصی ایجاد کا قصہ بالکل فرضی معلوم ہوتا ہے۔

رباعی جس طرح ایرانی الاصل ہے اسی طرح اس کے اوزان بھی ایرانی زاہیں اور اہل فن نے بحر ہزج (مفاعیلن ...... چار بار) سے اختراع کیے ہیں۔ رباعی ''دسنطور'' پر گائی جانے والی صنف ہے۔ سنطور ثقیل آوازوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ رُباعی کے اوزان میں جو لحنیں پیدا ہوتیں ہیں انہیں موسیقی کی اصطلاح میں ''ترانہ'' کہا جاتا ہے۔ چونکہ اس وزن سے پیدا ہونے والی لحنیں فن موسیقی میں بڑی پسندیدہ اور ایرانی موسیقی کے مذاق کے عین مطابق تھیں اس لئے ان اوزان کا نام ہی ترانہ رکھ دیا گیا۔ المعجم فی معائر اشعار العجم کے مؤلف محمد بن قیس رازی کی

رائے بھی یہی ہے۔

"اہل دانش ملحوناتِ ایں وزن را ترانہ کردند"

وزنِ رباعی کے استخراج کے سلسلے میں جو بنیادی اصول حدِ نظر رکھا جاتا ہے۔ وہ سبب پے سبب وتد پے وتد ہے یعنی رکن اوّل اگر سبب پر ختم ہو جاتا ہے تو اگلا رکن بھی سبب ہی سے شروع کیا جائے گا۔ اسی طرح وتد پر ختم ہونے والے رکن کے بعد والا رکن وتد ہی سے شروع ہوگا مثلاً

۱. مفعول	مفاعلن	مفاعیلن	فع
سبب وتد (مفروق)	وتد وتد	وتد+سبب+سبب	سبب
۲. مفعولن	فاعلن	مفاعیلن	فع
سبب+سبب+سبب	سبب+وتد	وتد+سبب+سبب	سبب

پہلا رکن وَتَد پر ختم ہوا ہے اِسی لئے دوسرا رکن وتد ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ اوزانِ رُباعی کے سلسلے میں کل نو زحاف مختص کئے گئے ہیں۔

خرب کف قبض حبّ ہتم تخنیق خرم شترّ بتر

کئی عروضیوں نے اپنی تحقیق کے ذریعے رُباعی میں نئے اوزان شامل کرنے کی کوشش کی ہے مگر اُن کی حیثیت ایجادِ بندہ سے زیادہ کچھ نہیں کیونکہ اُن حضرات نے نہ ہی سنطور دیکھا ہے، نہ ہی اس کے لحنوں سے حظ اُٹھانے کا موقع ملا ہے۔ اِسی لئے ان کا اجتہاد اُنہی تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔

ہمارے یہاں رُباعی کے آثار ابتدأ باضابطہ طور سے دکنی شعراء کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ ہر زمانے میں شعراء نے طبع آزمائی کی ہے۔ جن شعراء کی شہرت میں رباعی نے اضافہ کیا۔ اُن میں مومن، انیس، دبیر، مرزا یگانہ چنگیزی، جوش ملیح آبادی، رواں اُناوی، امجد حیدر آبادی، سیماب اکبر آبادی، آسی غازی پوری، فراق گورکھپوری کے نام قابل ذکر ہیں۔ امجد نے اپنی رباعیوں میں رباعی کے اصل مزاج کو برقرار رکھا ہے اور صوفیانہ مضامین تک ہی محدود کر دیا۔ اس کے

باوجود اُن کی رباعیوں میں سرشاری اور سرمستی کے ساتھ ساتھ بے ساختگی بدرجہ اُتم پائی جاتی ہے۔ جوان کے کیف واثر میں زبردست اضافہ کردیتی ہے چونکہ وہ عملی صوفی تھے۔ اسی وجہ سے تصوف ان کے یہاں وارداتِ قلبی کا درجہ رکھتا ہے۔

رباعیاتِ یگانہ، یگانہ آرٹ کا ستونِ اوّل ہے۔ اُن کے یہاں داخلیت کے ساتھ ساتھ بے ساختگی پائی جاتی ہے ان کی رباعیوں کے مصرعے اتنے ہموار ہیں کہ احساس ہوتا ہے کہ ایک شفاف ندی بہہ رہی ہے اور رباعی کا مشکل فن ان کے اظہار میں کہیں پر بھی مانع نہیں آتا۔ لکھنؤ کے مخصوص محاورے جس سلیقے سے ان کی رباعیوں میں قید ہو چکے ہیں اُس سے ان کی رباعیوں میں مزید لطف پیدا ہو چکا ہے۔ یگانہ اُردو میں پہلا خود پسند اور خود پرست شاعر تھا۔ رباعی کا فن اِنہی چیزوں کا متقاضی ہے ان کی رباعیاں پڑھ کر ڈاکٹر جانس کا یہ قول یاد آتا ہے:

"His art has the light touch of finish significant and condensed to the almost"

اُردو ادب میں رباعی کا وافر سرمایہ موجود ہے مگر جس طرح وقتاً فوقتاً غزل کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ اس طرح کا سلوک رباعی کے ساتھ روا نہیں رکھا گیا ہے۔ اس وجہ سے رباعی پسماندگی کا شکار ہو چکی ہے۔

عصر حاضر میں رباعی کی طرف شعراء متوجہ ہونے لگے ہیں۔ ان میں راغب مرادآبادی، فضا ابن فیضی، شمس الرحمٰن فاروقی، زاوک حمزہ پوری، ظہیر غازی پوری وغیرہ کافی اہم نام ہیں۔ ہم رباعی کو مختصر نظم کا بھی درجہ دے سکتے ہیں۔

●□●

صادقین کی رُباعیاں

فریدؔ پربتی

رباعی اپنے ہیئتی تنوع کے باوصف ہمارے ادب میں تشکیلی دور سے ہی تخلیقی اظہار کا وسیلہ بنی رہی ہے۔ اس صنف نے بہت سے شعراء کی شہرت میں اضافہ بھی کیا۔ اس کے باوجود خالص رباعی گو ہمارے یہاں نہ ہونے کے برابر ہیں اور یہ کمی بری طرح کھٹکتی ہے۔ ابوسعید ابوالخیر، خیام، سرمد، بابا افضل کاشانی (یا کاشی) باخرزی، عبد اللہ انصاری فارسی ادب میں خالص رباعی گو ہیں ان کی شہرت اور مقبولیت کا دارومدار تمام تر صنفِ رباعی پر ہے۔ ان شعراء نے اپنے تخلیقی تجربوں کے اظہار کیلئے خالصتاً اس صنفِ سخن کو استعمال میں لایا۔ اسکے برعکس اردو میں میر درد، مومنؔ، انیس، دبیر، امجد، یگانہ، جوشؔ، آسی غازی پوری، فراقؔ، راغب مرادآبادی، ناوک حمزہ پوری، امیر چند بہار، علقمہ شبلی، طہور منصوری نگاہ وغیرہ نے موضوعاتی تنوع، تسلسل خیال اور فکری ارتکاز کے ساتھ وافر تعداد میں رباعیاں ضرور کہی ہیں لیکن ان کو خالص رباعی گو نہیں کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے دیگر اصناف اور ہیئتوں کو بھی اپنے تخلیقی اظہار کیلئے بروئے کار لایا ہے۔ اردو میں اگر اس وقت کسی کو خالص رباعی نگار کہہ سکتے ہیں تو وہ صادقینؔ ہیں۔

صادقینؔ ایک ہمہ جہت فنکار ہے۔ وہ بیک وقت مصوری، خطاطی، نقاشی اور شاعری کو یکساں سطح پر اپنے تخلیقی اظہار کیلئے استعمال کرتے ہیں اور یہ بتانا بہت

ہی مشکل ہے کہ وہ ایک کامیاب مصور ہے یا شاعر۔ خطاط ہے یا نقاش۔ اس فنکارانہ تنوّع کے باعث ان کے کارناموں کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے۔ جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے اس میں انہوں نے اپنی طبعی مناسبت کی بنیاد پر رباعی کو ہی وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔ رباعی میں چونکہ فکری تسلسلِ اور ارتکازِ خیال کی پیوستگی مشق و ممارست کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے، اسی وجہ سے فنی اختصاص حاصل کرنے کیلئے غزل سے زمزمہ سنجی شروع کی جاتی ہے۔ صادقینؔ کا معاملہ اس کے برعکس ہے وہ اپنی طبیعت کو رباعی کے متصل پاتے ہیں۔ یہ ان کی خود آگہی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ دراصل انہوں نے ابتداء ہی میں اپنا طبعی میلان پالیا تھا۔

اس بات کا اظہار انہوں نے خود بھی ان الفاظ میں کیا تھا:

> ''صنف رباعی سے اپنی محبّت بچپن سے ہے نہ جانے کیوں اس میں ایک خاص حسن و جمال، ایک خاص متانت اور سنجیدگی نظر آتی ہے...... سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں میں نے باقاعدہ رباعیاں کہنی شروع کردی تھیں'' [1]

اس بات کا اظہار انہوں نے اپنی ایک رباعی میں نہایت مؤثر انداز میں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

شب میری تھی، شام میری دن تھا میرا
آیا ہوا خود مجھ پہ ہی جن تھا میرا
کتنی ہی رباعیاں تھیں لکھ کر پھاڑیں
اٹھارہ برس کا جبکہ سن تھا میرا

صادقینؔ کی رباعیوں کا مطالعہ کرتے وقت یہ مدنظر رکھنا چاہیئے کہ وہ ''یک فنے'' نہیں تھے۔ جہاں انہوں نے مصوری اور خطاطی میں نئے امکانات پیدا کردیئے ہیں وہیں بحیثیت رباعی گو لاتعداد رباعیاں لکھی ہیں جو رباعیاتِ صادقین (حصہ اول و دوم) بیاضِ صادقینی، اور جزوِ بوسیدہ کے ناموں سے منصۂ شہود پر آچکے ہیں۔

صادقیؔن کی رباعیوں کی سب سے پہلی خوبی جو فوراً اپنی گرفت میں لیتی ہے وہ ان کا بے ساختہ پن ہے۔ عام طور پر شعراء رباعی کے فن کو دقیق سمجھ کر اس سے صرفِ نظر کرتے ہیں اور اس کی جانب متوجہ اپنی قادر الکلامی دکھانے اور جملہ اصناف پر حاوی ہونے کے رجحان کو اجاگر کرنے کے تحت ہی ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ فنی اختصاص اور موضوعاتی تنوع سے عاری خصوصاً خارجی مضامین تک ہی اپنی رباعیوں کو محدود کر دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے یہاں یک رُخہ پن بھی ہوتا ہے۔ صادقیؔن کا چونکہ میلانِ طبع ابتداء ہی سے اس صنف کی طرف ہے اسی وجہ سے ان کی رباعیوں میں تسلسل خیال، فکری ارتکاز اور زبان و بیان کی بے ساختگی و خودرفتگی پائی جاتی ہے۔ اس طرح ان کی رباعیوں کے دو پہلو ایک فنی Artistic اور دوسرا جمالیاتی Aesthetic اُجاگر ہوتے ہیں۔ اس طرح ان میں ایک طرف اصول، شعور، غور و فکر اور معنی کے تشریحی نظام سے دوسری طرف جمالیاتی قدروں کے تحت وجدان، ذوق اور لاشعور سے اور جذبۂ احساس، کلچر اور زبان کی روایت اور مزاج سے بھی واسطہ جا بجا پڑتا ہے۔ یہ بھی ایک سبب ہے کہ ان کے یہاں فنی دقائق تخلیقی تجربوں کے تابع مہمل بن کر ابھرتے ہیں۔ یگانہ چنگیزی (یگانہ آرٹ کے حوالے سے) کے بعد اگر کسی رباعی نگار کا فن ان خصوصیات کا متحمل ہے وہ صادقین ہے۔

ہر حرف میں مہ پاروں کے قد بنتے ہیں
لوحوں پہ وہ اک حسن کی حد بنتے ہیں
کاکل کے خیال ہی میں لکھتا ہوں لام
ابرو کے تصور میں ہی حد بنتے ہیں

صادقین فن کا ایک آفاقی نظریہ رکھتے تھے۔ وہ نظریاتی نقطۂ نگاہ سے فن کو نہیں دیکھتے تھے۔ ان کی وابستگی اگر تھی تو وہ صرف آفاقی قدروں اور ایک مثبت نظام حیات سے تھی۔ ایک واقف کار اور خود آگاہ تخلیق کار کیلئے "کیا کہنا ہے" مسئلہ

نہیں ہوتا ہے "بلکہ کیا نہیں کہنا ہے" ہوتا ہے۔ ہر کامیاب تخلیق کا تضادات میں ترتیب پیدا کرنے کا ڈھب وضع کرتا ہے۔ صادقین کی رباعیوں سے ان کے رجحانات، خود آگہی اور واقف کارانہ ذہنیت قدم قدم پر الم نشرح ہو جاتی ہے اور متنوع جہانوں کی سیر کرتی ہے:

جو نقش تھے پامال بنائے میں نے
پھر اُلجھے ہوئے بال بنائے میں نے
تخلیق کے کرب کے جو کھینچی تصویر
پھر اپنے خدوخال بنائے میں نے

رحمت کی کڑی دھوپ میں لیٹوں مولیٰ
رومال میں خرمن کو لپیٹوں مولیٰ
اب اور مجھے بخش کے حیران نہ کر
دے اتنا کہ جتنا میں سمیٹوں مولیٰ

اسی وجہ سے ان کی بیشتر رباعیاں لب ولہجہ رکھتی ہیں۔ وہ اپنی فنی اور تخلیقی کارفرمائیوں کے ڈانڈے کافی دور تک پھیلائے ہیں۔

اس ہستیِ منجلی سے ورثے میں ملا
اللہ کے اُس ولی سے ورثے میں ملا
قرآن کی آیات کو لکھنے کا یہ شوق
مجھ کو حضرت علیؓ سے ورثے میں ملا

صادقین کے یہاں زبردست فنی اور فکری تنوع پایا جاتا ہے۔ البتہ ان کی تخلیقی قوتوں کی درجہ بندی کرنا بہت مشکل اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔ بعض اصحاب نے اگرچہ اس کی کوشش کی بھی ہے۔ مہدی عباس حسینی نے بغیر کسی تردد کے ان کے فکرو فن کے بارے میں یہ زاویۂ نگاہ پیش کیا ہے کہ:

"صادقین کی ہمہ جہت شخصیت کے تین پہلوان کے فن پاروں میں خاص طور پر ابھر کر آئے ہیں ہم انہیں تلاشِ ذات، کربِ آگہی اور جہدِ مسلسل کہہ سکتے ہیں"۔ ۲

دراصل ایک کامیاب فنکار کی کامیابی اس بات پر منحصر ہے کہ اس کا فن اوراس کی فکر کتنی کثیر الجہت ہے۔ جتنی اس کی شخصیت میں جہتیں ہوں گی اتنی ہی جہتیں اس کے فن میں بھی ہوں گی۔ آج کا فرد بین الاقوامی سطح پر لایعنی اور تضاد سے بھرپور زندگی جی رہا ہے۔ اریس (Ares) کے متعلق ہومر ایلیڈ میں لکھتا ہے کہ "وہ درد کے مارے ڈہاڑتا ہے اور زخمی ہوکر رفو چکر ہو جاتا ہے۔ بہر کیف جنگ سے اس کا تعلق بڑا گہرا ہے اور فنونِ جنگ میں اس کی مہارت مسلم ہے"۔ ہمارا دور بھی جنگ، زخم اور درد سے بھرپور دور ہے۔ ہر عصر کے مقدر میں یہی ہے۔ دراصل ایک تخلیق کار جتنا اپنے عصر سے وابستہ ہوگا، اتنا ہی اس کا فن جنگ کا، زخم اور درد کا آئینہ دار ہوگا۔ صادقین کی رباعیاں ان تجربوں سے معمور اور مزین ہیں۔ اس کا اندازہ نہ صرف ان کی رباعیوں سے ہوسکتا ہے بلکہ ان کے اس بیان سے بھی:

"گزشتہ چند برس میں، معاملاتِ خلوت سے لیکر مکالماتِ جلوت تک اور نظریاتِ فطرت سے لیکر مشاہداتِ قدرت تک جملہ موضوعات پر رباعی گوئی کا سلسلہ جاری رہا ہے اور مجموعی طور پر جمالیاتی رباعیات سے جلالیاتی اور رباعیات تک مسلسل کہیں سطور میں اور کہیں بین السطور میں منافقت کے خلاف اعلانِ جنگ کا تار پرویا ہوا ہے"۔ ۳

صادقین کے یہاں بھی ایک عجیب طرح کا احتجاج نظر آتا ہے۔ یہ احتجاج دراصل غیر مختتم جبر کے خلاف ایک فرد کا احتجاج ہے:

پھولوں کو ملی بلخ سے تھالی مجھ کو
بغداد میں زیتون کی ڈالی مجھ کو
لاہور میں دی گئی ہے لیکن اے دوست
خطاطی کے اعجاز پہ گالی مجھ کو

میں بغض کے انبار سے کیا لاتا ہوں
اس میں بھی عقیدت کی ادا لاتا ہوں
جو زہر کہ واعظ نے ہے اگلا اُس سے
تریاق نکالے ہی چلا جاتا ہوں

صادقین کی رباعیوں میں جو بے ساختگی پائی جاتی ہے اس کے ڈانڈے بغیر کسی تعمیہ وتخرجہ کے سہل ممتنع سے مل جاتے ہیں۔ ان کے یہاں فنی دروبست اور زبان وبیان کا وہ حسن پایا جاتا ہے جو صنف رباعی میں ان سے بیشتر خال خال ہی نظر آتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ روزمرہ میں بھی حسن ہوتا ہے البتہ اس کو پانے کیلئے حساس کان ہونے چاہئیں۔ چونکہ صادقین اس رمز سے بخوبی واقف ہیں اسی وجہ سے ان کی رباعیاں لوک گیت کی حدوں کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہیں:

شہبازِ نبیؐ چرخ پہ منڈلایا تھا
اک پل کو نظر اس کا جو پر آیا تھا
تو چاہِ ابوجہل کا بوڑھا مینڈک
کہتے ہیں بڑے زور سے ٹرّایا تھا

ایک فعال تخلیقی ذہن کی صحیح وسعتوں کو سمجھنے کیلئے شعری پیکر ہمیشہ معاونت کرتے ہیں۔ شعری پیکروں کی تفہیم شعور کی بنیادوں پر ہوتی ہے اسی وجہ سے ایک تخلیقی ذہن کے یہاں حسی، بصری، لمسی، سمعی، شامعی پیکر پائے جاتے ہیں۔ عربی شاعری کے بارے میں ایک مستشرق نے کہا تھا کہ اس کے تخلیق کرنے والے نے اسے حواسِ خمسہ سے تخلیق کیا ہے کہ کیوں اس میں تقریباً جملہ شعری پیکر پائے جاتے ہیں۔ صادقین چونکہ ہمہ جہت فنکار تھا اسی وجہ سے اس کے یہاں شعری پیکروں کی بھرمار موجود ہے۔ البتہ بصری اور حسی پیکر زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے یہاں تختی، خون، لوح، قلم، زلف، مکھڑا، ساغر، دھوپ،

ذرہ، جلاّد، قطرہ، گیسو، لب، رنگ، رخسار، تل، سانپ وغیرہ قسم کی لفظیات پائی جاتی ہے جس سے ان کی رباعیوں میں حرکی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔

ہم سانپ پکڑ لیتے ہیں بینوں کے بغیر
فصلیں بھی اُگاتے ہیں زمینوں کے بغیر
ہم اہلِ کرامات کا لیکن یارو
دل ہی نہیں لگتا ہے حسینوں کے بغیر

☆

ساقی نے ہمیں ساغرِ جم بخشے ہیں
ہاتھوں میں سیہ زلف کے خم بخشے ہیں
مولیٰ نے حسینوں سے وفا کے بدلے
دنیا میں ہمیں لوح و قلم بخشے ہیں

مومنؔ نے اردو شاعری میں اپنی معنی آفرینی، نازک خیالی، خلاقانہ ذہنیت کی باعث ایک دیرپا نقش چھوڑ دیا ہے۔ ''انہوں نے حقیقی معنوں میں اردو غزل کو سچ بولنا سکھا دیا ہے'' [۴] اپنے نام کی مناسبت سے مومن نے گاہ گاہ ایسے مضامین پیدا کیے ہیں جن سے ان کی غزل کے مقطعے ایک خاص لطف کا نمونہ بن گئے ہیں۔ چونکہ ان کا تخلص زہد و ورع اور پارسائی کے ہم معنی اور عیش وطرب، میخواری میخوری اور بت پرستی کی ضد ہے ان دونوں معنوں کو اکٹھا کر کے مومنؔ نے اپنی غزلوں کے مقطعوں میں ایک خاص خصوصیت پیدا کرلی ہے:

عمر تو ساری کٹی عشقِ بتاں میں مومنؔ
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے
ہو گئے نامِ بتاں سنتے ہی مومنؔ بیقرار
ہم نہ کہتے تھے کہ حضرت پارسا ہونے کو

صادقین نے جہاں اپنی رباعیوں میں دیگر طریقوں سے موضوعات

تنوع پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، وہیں اپنے نام کی انفرادیت اور اس میں موجود ''حرفِ قاف'' کی جہتوں کی مختلف انداز سے توضیح کر دی ہے، جن سے ان کی فنکارانہ صلاحیتیں الم نشرح ہو جاتی ہیں:

''کے'' اس کا اگر اسم تو اس کا ''جسم'' نام
اور بعض تو ہوتے ہیں بہت ہی ''کم'' نام
اک نام کے ہر گلی میں ہوتے ہیں کئی
میرا کوئی دنیا میں نہیں ہے ''ہم نام''

☆

ہیں قاف سے خطاطی میں پیدا اوصاف
ابجد کا جمال جس کا کرتا ہے طواف
بن مقلہ ہو، یاقوت ہو یا ہو یہ فقیر
ہم تینوں کے درمیانِ اسما میں ہے قاف

ان کو اس بات پر فخر ہے کہ دنیا میں ان کا کوئی ہم نام نہیں ہے اور وہ اپنے نام کے تنِ تنہا ہیں:

گر اپنی ثنا عام نہیں دنیا میں
پھر تو مجھے کچھ کام نہیں دنیا میں
یکتائی کا دعویٰ فقط اس بات پہ ہے
کوئی مرا ہم نام نہیں دنیا میں

تخلیقی صلاحیتیں کسبی نہیں بلکہ وہبی ہوتی ہیں البتہ ماحول، تربیت اور تعلیم اس میں ضرور اضافہ کرتے ہیں۔ فلسفے کے سرنائی اسکول (Cyrenaie School) جسکے بانی سقراط کے ایک شاگرد ارسطیفوس (Aristiphes) تھے، کے نظریات کو عام طور لذتیت پسندی کا نام دیا جاتا ہے یعنی وہ نقطۂ نظر جو مسرت یا طمانیت کو انسان کا نصب العین قرار دیتا ہے۔ سرنائی فلاسفہ کے نزدیک جس طرح

کی زندگی گزارنے سے انسان کو زیادہ سے زیادہ مسرت یا طمانیت حاصل ہوگی وہ سب سے بہتر زندگی ہے۔ البتہ تعلیم اور تربیت کا مقصد ان راستوں پر رہبری کرنا ہے، جن پر چل کر انسان کو زیادہ سے زیادہ خوشی، تسکین اور طمانیت حاصل ہو۔ صادقین کے یہاں بھی اسی نوع کی لذتیت کا رجحان پایا جاتا ہے کیونکہ ہر تخلیقی تجربہ جب انکے سامنے تکمیل یافتہ شکل میں آتا ہے، ان کو مکمل مسرت اور طمانیت حاصل ہو جاتی ہے یہ مسرت تلاشِ ذات اور کربِ آگہی کی یافت کا تکملہ ہے:

تخلیق کے سقف و بام پاٹے جائیں
یاقوت کے پس خوردہ کو چاٹے جائیں
مخلوقِ خدا چوم رہی ہے مرے ہاتھ
کاتب یہ مگر کہتے ہیں کاٹے جائیں

☆

خود اپنے طریقے میں قلندر میں ہوں
خود اپنے سلیقے میں ہنرور میں ہوں
خود اپنے بنائے ہوئے آئینوں میں
خود گیر ہوں، خود نگر ہوں خود گر ہوں میں

صادقین کی بہت سی رباعیاں حسن و جمال کے موضوع پر ہیں۔ انہوں نے حسن و جمال کو مصور کی آنکھوں سے دیکھا ہے اور شاعر کے قلم سے بیان کیا ہے، جس کو ہم ادبی مصوری سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ”جمالیاتی ذوق ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے وہ حسن کو مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں اور اس سے حظ حاصل کرتے ہیں“۔[۵] فراق صاحب کے یہاں بھی اس طرح کی ادبی مصوری پائی جاتی ہے جس کے ڈانڈے وہ شرنگار رس سے ملاتے ہیں۔ وہ حسن کو خالی دیکھتے نہیں بلکہ اسے چھوتے بھی ہیں۔ جنس ان کے یہاں قوت بن کر ابھرتا ہے اس کے برعکس صادقین کے یہاں ”دیکھنا بھی تو اسے دور سے دیکھا

کرنا"٦ والا معاملہ نظر آتا ہے۔ یہ بھی ایک سبب ہے کہ انکے یہاں حسن ایک کمزوری بن کر ابھرتا ہے۔ اس طرح ان کی اس قسم کی رباعیوں کو زیادہ سے زیادہ سراپا نگاری یا روایتی معاملہ بندی کا درجہ دے سکتے ہیں۔ فراق کے یہاں جنس محدود معنوں میں نہیں بلکہ وسیع معنوں میں پیش ہوا ہے اسی وجہ سے ان کے یہاں نفسیاتی، جذبات اور احساساتی، جمالیاتی تجربات مکرر نظر آتے ہیں۔ شرنگار ہمارے ادب میں فراق صاحب سے بہت پہلے دکنی شعراء خصوصاً قلی قطب شاہ کے یہاں پایا جاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اردو میں شاستروں کا ترجمہ بھی پہلے پہل ہوا:

گیسو میں وہ سنبل کے چمن ہیں معلوم
سینڈے میں وہ نکلتے جو سمن ہیں معلوم
وہ جو ترے حمام میں آئینے ہیں
ان کو ترے سب راز بدن ہیں معلوم

☆

تو ہے کہ ایلورا کی کوئی مورتی ہے
اتنی جو بدن کی تری خوبصورتی ہے
اعضائے نمودار کی گولائی سے
رہ رہ کے تری جنسی کشش گھورتی ہے

صادقین کے یہاں عجیب طرح کی کاٹ اور تیکھا پن پایا جاتا ہے۔ اپنے اندازِ بیان کو زیادہ سے زیادہ موثر بنانے کیلئے انہوں نے مختلف پیرایۂ بیان اختیار کیے ہیں۔ انہوں نے اپنی رباعیوں میں بیچ بیچ میں ایسا متکلمانہ اندازِ بیان اپنایا ہے جس سے ان کی رباعیوں میں ڈرامائیت پیدا ہوگئی ہے اور باضابطہ طور پر چلتے پھرتے کردار نظر آتے ہیں۔ اس ڈرامائیت سے ان کا اندازِ بیان بے تکلف ہونے کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ مؤثر بن گیا ہے:

عاشق کے لئے رنج و الم رکھے ہیں
شاہوں کیلئے تاج و علم رکھے ہیں
"میرے لئے کیا چیز ہے؟" میں نے پوچھا
آئی یہ صدا "لوح و قلم رکھے ہیں"

☆

دلّی سے وہ جا رہا تھا جس دم قندھار
لاہور کی مہ وشوں پہ، سن تو اے یار
میں نے ہی نہیں، مجھ سے صدیوں پہلے
تھے طالب آملی نے لکھے اشعار

اپنے تخلیقی اظہار کو زیادہ سے زیادہ موثر اور شعری حسن میں اضافہ کرنے کیلئے شعراء مختلف شعری صنعتوں کا استعمال کرتے ہیں۔ ان صنعتوں میں حسن تب پیدا ہو جاتا ہے جب ان کو اپنے اسلوب کا تابع بنایا جائے۔ صنعتیں معنوی بھی ہوتی ہیں اور لفظی بھی۔ ان میں تجنیس، تکرار لفظ یا ذوقافیین مع الحاجب یعنی دوقافیوں کے درمیان ردیف لانا بھی ہیں۔ صادقین نے اس شعری صنعت سے زبردست فائدہ اٹھایا ہے:

ان کی تو یہ عرفانی منازل میں سے ہے
اور میرے بھی وجدانی مراحل میں سے ہے
خطاطی میں کرتا ہوں کہ یہ بھی دوست
اسلاف کے روحانی مشاغل میں سے ہے

☆

تن کے لئے احکامِ دقیقہ بھی سناؤ
غسلِ مخصوص کا سلیقہ بھی سکھاؤ
نظریں برا کام کر کے طاہر ہوں، مجھے
اے اہلِ شریعت وہ طریقہ بھی بتاؤ

رباعی پر ابتداء ہی سے تصوف اور مابعد الطبیعاتی مضامین کی زبردست گرفت رہی ہے، جس نے رباعی کے دامن کو تنگ کر دیا بلکہ مخصوص طائفہ تک ہی محدود رکھا۔ ایک زمانے تک رباعی کے لئے رثائی مضامین، بے ثباتی دنیا، جوانی، بڑھاپا وغیرہ قسم کے مضامین ضابطہ بند طریقے پر مخصوص کیئے گئے۔ یگانہ واحد شاعر ہے جس نے اپنی رباعی پر تصوف کا سایہ پڑنے نہیں دیا۔ صادقین کا میلانِ طبع چونکہ تصوف کی طرف نہیں تھا اسی وجہ سے انہوں نے اپنی رباعیوں میں مابعد الطبیعاتی مضامین کو جگہ نہیں دی ہے۔ ان کے شعر اسلوب پر اگرچہ انیس، امجد، یگانہ کا اثر کہیں کہیں صاف طور پر جھلکتا ہے۔ ملاحظہ کیجیئے انیس کے لہجے کا عمومی اثر:

تخلیق میں معتکف یہ ہونا میرا
اب تک شبِ ہستی میں نہ سونا میرا
خطاطی ادھر ہے تو اُدھر نقاشی
وہ اوڑھنا میرا یہ بچھونا میرا

یگانہ کا رنگ سخن اس رباعی میں راست طریقے سے نظر آتا ہے:

شاگرد کسی کا ہوں نہ استاد ہوں میں
کرتا ہوا تخلیق اور ایجاد ہوں میں
لیلائے ہنر ہے اگر بنتِ لاہور
پھر واقعی لاہور کا داماد ہوں میں

صادقین کے یہاں خلوص، شفافیت اور بے تکلفی پر مشتمل جتنا تخلیقی سرمایہ موجود ہے وہ ہمیں اردو کے بڑے بڑے شعراء کے یہاں بھی نظر نہیں آتا ہے۔ یہ زندگی اور فطرت کی زمزمہ آرائیوں سے معمور ہیں۔ اسی وجہ سے میں نے ابتدا ہی میں اسے ادبی مصوری کا نام دیا۔ ان کی رباعیوں کی ان خصوصیات کے پیشِ نظر فرانس کی ہلوئی Heloise کے وہ لافانی الفاظ بے ساختہ یاد آتے ہیں جو

انہوں نے ابی لاور کو خونِ دل سے لکھے تھے:

"میں ایسا خط نہیں چاہتی جس سے تمہاری علمیت یا فضیلت ظاہر ہو۔
میں تو ان بولوں کے سننے کے مشتاق ہوں جو بیساختہ تمہارے دل
سے نکلے ہوں"

صادقین کی رباعیوں میں نہ علمیت نہ ہی فضیلت ہے البتہ خلوص، شفافیت اور بے تکلفی ان کی رباعیوں کا اصل جوہر ہے اور یہی ان کی انفرادیت کی ضمانت بھی ہے۔

حواشی:

۱. بیاضِ صادقینی، صادقین بحوالہ آج کل (اردو) ص: ۱۵/ اکتوبر ۱۹۸۲ء
۲. آج کل (اردو) ص، ۶۶، ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۸ء
۳. رباعیاتِ صادقین، ص: کتابی دنیا، دہلی
۴. ظہیر احمد صدیقی، ص: ۱۸۳، بحوالہ اردو غزل، اردو اکادمی، دہلی
۵. آج کل (اردو) ص: ۶۸، ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۸ء
۶. دیکھنا بھی تو اسے دور سے دیکھا کرنا...... شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا۔
(حسرت موہانی)

●□●

خاکسار کے ایک شعر پر میرؔ کی اصلاح

فریدؔ پربتی

اُردو شعروادب میں میر تقی میرؔ اپنے مخصوص شیوۂ گفتار، منفرد لب ولہجہ، خلّاقانہ فکری صلاحیتوں اور فنی معلومات کی وجہ سے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے ایک شاعر کی حیثیت سے اُردو شاعری کے جملہ اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ جس سے اُن کے میلانِ طبع اور تخلیقی قوتوں کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اپنی شاعرانہ قوت وصلاحیت کا میر کو خود بھی احساس تھا۔ جس کا اظہار انہوں نے اپنی شاعری میں جا بجا کیا ہے مثلاً

اس فن میں کوئی بے تہ کیا ہو کوئی معارض
اوّل تو مستند ہوں پھر یہ میری زبان ہے

ریختہ رتبے کو پہنچایا ہوا اُس کا ہے
معتقد کون نہیں میر کی استادی کا

جلوہ ہے مجھی سے لبِ دریائے سخن پر
صد رنگ مری موج ہے میں طبعِ رواں ہوں

میرؔ نے جہاں ایک طرف اپنی شاعری سے اُردو کے شعری سرمایہ کو مالا مال کیا ہے وہاں دوسری طرف ایک تذکرہ نگار کی حیثیت سے اُن کی خدمات سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ایک تذکرہ نگار کی حیثیت سے انہوں نے اُردو زبان کی تشکیل وارتقاء کا مطالعہ کرنے والوں کو جو مواد بہم پہنچایا ہے اس کو کسی وقت

کسی طور سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ان کا معرکتہ الآرا تذکرہ ''نکات الشعراء'' اُردو ادب کی تاریخ میں کافی اہمیت کا حامل ہے۔

یہ تذکرہ لکھنے میں میر کو بادی النظر میں جہاں اور مقاصد پیش نظر رہے ہیں وہاں یہ مقاصد بھی کلیدی حیثیت رکھتے ہیں:

(۱) خان آرزو کے گروہ کی تحسین (۲) اپنا اور اُن شعراء کا، جن سے اُن کے خوشگوار تعلقات تھے فوق جتانا (۳) میرزا جانِ جاں مظہر کے گروہ کی تنقیص۔

ان وجوہات کی بناء پر ''نکات الشعراء'' کے اسلوب میں جانب داری اور غیر سنجیدگی پیدا ہوگئی ہے۔ اسی وجہ سے جہاں گروہ اول کا تفوق دکھانے کی کوشش کی گئی ہے اور ان کا وزن و وقار بڑھانے کیلئے اُن کی شخصیت اور شاعری کے محاسن جانب دارانہ طور پر منصۂ شہود پر لانے کی کوشش کی گئی ہے وہاں دوسری طرف گروہ ثلث کی شخصیت اور فن کو کاواک انداز میں اور جانبدارانہ طریقے سے مسخ اور بے چہرہ کرنے کی سعئِ لاحاصل پر پورا زور صرف کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس سلسلے میں میر نے کئی اوچھے ہتھیار اپنائے ہیں ان میں دو ایک خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

(۱) شخصی طعن و تشنیع (۲) شاعری اور فنی معلومات پر اعتراضات اور اصلاح مع توجیہ۔

میر کے اس رجحان اور روئیے پر ان کے معاصرین نے جابجا احتجاج کیا ہے۔ جس میں شاہ حاتم، سودا، نثار اور مصحفی پیش پیش رہے ہیں۔ نکات الشعراء کے متعلق مختلف شعراء کے یہ اشعار خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ہے جو کچھ نظم و نثرِ عالم میں
زیرِ ایرادِ میر صاحب ہے
ہر ورق پر ہے میر کی اصلاح
لوگ کہتے ہیں سہو کاتب ہے
(سودا)

پگڑی اپنی سنبھالئے گا میرؔ
اور بستی نہیں یہ دلّی ہے
(بقاء)

ہونا بہت آسان ہے شیطان سے مشہور
پر ہو تو لے اوّل کوئی دنیا میں ولی سا
(مصحفیؔ)

میرؔ نے بقولِ قاضی عبدالودود "۹ر شعراء کے ۱۱۰ر اشعار پر اصلاح دی ہے"[1]
جبکہ مشاطۂ سخن میں صفدر مرزاپوری نے ۱۰ ر شعراء، پر میر کی اصلاحوں کا ذکر کیا ہے جن میں شاہ مبارک آبرو، مضمون، حاتم، یکرنگ، شاکر ناجی، میر سجاد، محمد تحسین کلیم، انعام اللہ خان یقین، میر محمد یار خاکسار اور لالہ نیک چند بہار کے نام شامل ہیں۔[2]

جن شعراء کے کردار، شخصیت اور کلام پر میر نے اوچھے، رکیک اور سوقیانہ حملے کئے ہیں۔ اُن میں خاکسار خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ خاکسار کے متعلق "نکات الشعراء" میں میر رقمطراز ہیں:

"محمد یار، خاکسار تخلص، عرف کلو۔ شخصے است خادم درگاہ قدم شریف حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ شعر ریختہ می گوید و خود را دور می کشید و بسیار سفلگی می کنند بلکہ ارتنک آبی بنائے ریختہ را آب رسانیدہ چنانچہ علی الرغم این تذکرۂ نوشتہ است بنام معشوق چہل سالۂ خورد و احوال خود را اوّل از ہمہ نگاشتہ و خطاب خود (را) سید الشعراء پیش خود قرار دادہ آتشِ کینہ کہ بے سبب افروختہ است چوں کباب بو می دہد۔ ایں قسم پئے من ریسماں می تابد کہ (تو) گوئی پسر رسن تاب اسد۔ محمد معشوق کنبوہ کہ مردے است نائب میر بحر، بسیار گرم جوش و یار باش

[1] معاصر۔ پٹنہ حصہ ۱۵ ص ۱۳۔۱۴

[2] مشاطہ سخن۔ صفدر مرزاپوری ص ۲ تا ۵۔ مطبوعہ ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۱۷ء

(است) چون شنید کہ خاکسار کلّو ہم نام دارد بداہتاً گفت، مصرع:

کتّا ہے دربار کا کلّو اس کا نام

چوں کلوا کثر نام سگہا می گذارند، لطف ہم رسانید، ہر کہ رابہٗ او دیداست می داند، فخر او ہمہ برریختہ است، طرفہ این کہ آں ہم نامربوط وخوداو ہم نادرست تقلید مرزا جانِ جاں مظہر در ہر امری کنند (باوصف آنکہ ہیچ رتبہ ندارد) اگر کسے تکلیف شعر کنند، گوید کہ وقتے بیمار بودم۔ آہ آہ من ایں رنگ داشت سبحان اللہ مردماں ایں راشعر می نامند۔ بابا من شعر نمی گویم وباایں برادرانِ یوسف کہ ماشاعران باشیم (ربطے ندارم، معاف دارید) الغرض بسیار کم فرصت و بے تہ است" [1]

یوں تو میر اور خاکسار کے تعلقات کی خرابی کے متعلق دیگر تذکرہ نگاروں نے بھی لکھا ہے اور مختلف اسباب بیان کئے ہیں مثلاً

"شعراء متقدمین میں شمار کیا گیا ہے۔ سودا، میر حسن سے پیشتر تھا۔ میر تقی میر لڑکپن میں جب شعر کہتا تھا، خاکسار اس کو اصلاح دیا کرتا تھا۔ لیکن میر اپنے تذکرے میں یہ ذکر نہیں کرتا۔ بلکہ وہ خاکسار کو بسببِ غرور اور سرکشی کے ملزم کرتا ہے۔ خاکسار چونکہ ملقب بہ لقب "شاہ الشعراء" تھا۔ اس دعوے کو میر نہیں مانتا" [2]

مصحفی نے بھی اِسی سے ملتی جلتی رائے اپنے تذکرے میں درج کی ہے:

"گوید کہ میر تقی میر در عالم شباب منظورِ نظر او بود" [3]

لیکن میرے خیال میں خاکسار کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ وہ مرزا جانِ جاں مظہر کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے جس کا ذکر میر نے ان الفاظ میں کیا ہے:

---

[1] تذکرہ نکات الشعراء۔ مرتب محمود الٰہی۔ اُتر پردیش اکادمی (لکھنؤ) ص ۱۱۴

[2] تذکرہ کریم الدین ص ۸۹ بحوالہ میر تقی میر۔ حیات اور شاعری خواجہ احمد فاروقی ص ۳۱۳

[3] تذکرۂ ہندی۔ مصحفی ص ۸۸

"تقلیدِ مرزا جانِ جاں مظہر در ہر امری کنند (باوصف آنکہ ہیچ رتبہ ندارد)[1]

میر نے اپنے تذکرے میں خاکسار کے جو اشعار منتخب کئے ہیں اُن کی تعداد ۱۲ ہے ان میں سے ایک شعر ہے

خاکسار اُس کی تو آنکھوں کے کہے مت لگیو
مجھ کو ان خانہ خرابوں ہی نے بیمار کیا

اس پر اعتراض کیا تھا کہ "بر متبع این فن پوشیدہ نیست کہ بجائے "بیمار کیا" "گرفتار کیا" می بایست" [2]

میر کے اس جملہ معترضہ کا سب سے پہلا جواب میر حسن نے اپنے تذکرہ میں توجیہ کے ساتھ دیا تھا۔

خاکسار اُس کی تو آنکھوں کے کہے مت لگیو
مجھ کو ان خانہ خرابوں ہی نے بیمار کیا

میر تقی میر گوئید کہ اگر بجائے "بیمار کیا" "گرفتار کیا" می شد بہتر می بود لیکن در عقل فقیر چنیں میگزرد کہ اگر چشم خود بود گفتار مناسب بود۔ چو این جا چشمِ معشوق است بیماری صحت دارد" [3]

میر کی اصلاح پر یہ پہلا جواب مع توجیہہ کے تھا۔

صفدر مرزا پوری نے ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۹۱۷ء اساتذہ سلف و خلف کی اصلاحوں پر مشتمل ایک کتاب "مشاطۂ سخن معروف بہ شمع سخن وری" کے نام سے شائع کی۔ اس میں مختلف اساتذہ کی اصلاحوں کو توجیہات کے ساتھ درج کیا گیا تھا۔ میر کی اصلاحوں کے سلسلے میں انہوں نے دیگر اشعار کے ساتھ خاکسار کا یہ شعر بھی مع توجیہہ درج کیا تھا۔

---

[1] نکات الشعراء۔ میر تقی میر مرتب محمود الٰہی ص ۱۱۴

[2] نکات الشعراء ص ۱۱۵

[3] تذکرۃ الشعراء اردو ص ۸۶

خاکسار اُس کی تو آنکھوں کے کہے مت لگیو
مجھ کو ان خانہ خرابوں ہی نے بیمار کیا

خاکسار اُس کی تو آنکھوں کے کہے مت لگیو
مجھ کو ان خانہ خرابوں نے گرفتار کیا

''خاکسار نے آنکھوں کی رعایت سے ''بیمار کیا'' کہا مگر میر صاحب فرماتے ہیں کہ جاننے والے جانتے ہیں کہ بجائے ''بیمار کیا'' ''گرفتار کیا'' چاہئے [1]

''دستور الاصلاح'' میں سیماب اکبر آبادی نے جہاں مختلف اساتذۂ سخن کی اصلاحوں کا جائزہ فنی معلومات کی روشنی میں کیا ہے اور ان پر محاکمہ پیش کیا ہے وہاں انہوں نے میر کی اصلاح کا بھی جائزہ لیا ہے۔ البتہ سیماب صاحب سے ایک سہو ہوا ہے وہ یہ کہ انہوں نے شعر کے مصرع اولیٰ کو غلط لکھا ہے جس سے کافی الجھاؤ پیدا ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو سیماب صاحب کی توجیہ اور خاکسار کا شعر۔

خاکسار اُس کی تو آنکھوں سے گھنے مت لگیو
مجھ کو ان خانہ خرابوں ہی نے بیمار کیا

''توجیہ۔ چشم محبوب کی رعایت سے قافیہ بیمار صحیح تھا اگر اپنی ''آنکھوں کا ذکر ہوتا تو گرفتار کہنا حق بجانب تھا اس لئے شعر علی حالہ درست تھا اصلاح سمجھ کر نہیں دی گئی ہے'' [2]

سیماب اکبر آبادی کی توجیہہ کا جواب مختلف اربابِ نقد و نظر نے دیا ہے جن میں ابر احسنی گنوری، صغیر احسنی گنوری (شاگردِ احسن مارہروی) شمس الرحمٰن فاروقی اور عنوان چشتی خاص طور پر قابل ذکر نام ہیں۔ ذیل میں اُن جائزوں کو پیش کیا جاتا ہے جو انہوں نے ایک دوسرے کے محاکموں پر اپنی فنی معلومات

---

[1] مشاطۂ سخن۔ صفدر مرزا پوری: ص ۵

[2] دستور الاصلاح کے سیماب اکبر آبادی۔ ص ۵۶

کی روشنی میں کہے ہیں۔

اس سلسلے کی پہلی کڑی ابراحسنی گنوری (تلمیذ احسن مارہروی) ہے۔ ابراحسنی نے صرف سیماب اکبرآبادی کی اصلاحوں کا جواب مختلف اوقات میں مختلف رسائل میں دیا ہے بلکہ ان کی متنازعہ فیہ ''دستور الاصلاح'' کا مدلل جواب اپنی کتاب ''اصلاح الاصلاح'' کے ذریعے سے دیا ہے۔ ''اصلاح الاصلاح'' میں اگرچہ دیگر اصلاحوں کے ساتھ متذکرہ بالا شعر پر سیماب صاحب کی توجیہہ کا شرح وبسط کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے لیکن ان کا دھیان مصرع اولیٰ میں سیماب صاحب کی تحریف کی طرف نہیں گیا ہے ابراحسنی صاحب نے توجیہہ سیماب اکبرآبادی کا جائزہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے ملاحظہ ہو:۔

''جوابِ ابر: اصلاح بجائے خود نہ صرف صحیح ہے بلکہ اُس سے شعر کی معنویت بھی بڑھ گئی اور جدّت بھی پیدا ہوگئی ہے۔ سیماب صاحب کا اعتراض ہے کہ چشمِ محبوب صرف بیمار کرسکتی ہے اور اپنی آنکھیں گرفتار خود نہیں کرتیں بلکہ حسن کو دیکھ کر گرفتار کرا دیتی ہیں۔ محبوب کی آنکھیں عاشق کو بیمار کرتی ہوں یا نہ کرتی ہوں مگر ایک طالب کو گرفتارِ محبت ضرور کرلیتی ہیں پھر اساتذہ کا مسلمہ یہ ہے کہ محبوب کی آنکھیں بیمار ہوتی ہیں نہ یہ کہ وہ ہر کسی کو بیمار کردیتی ہیں۔ اگر ذرا دقیق نظر سے دیکھا جائے تو اصلاح کی صحت اور عظمت مسلّم ہے چشم محبوب کو ''خانہ خراب'' کہا ہے جسکے معنی یہ ہیں کہ عاشق کا خانۂ دل خراب کر دینے والی ہیں۔

دنیا میں ایسے مشاہدات اکثر ہیں کہ جس کی گرفتاری ہوتی ہے اُس کا گھر بھی لوٹ لیتے ہیں فاتح فوج مفتوح اقوام کے ساتھ یہی سلوک کرتی ہے۔ عشق وحسن کے میدان میں آئے تو ہر قدم پر یہ

مثالیں ملیں گے کہ چشمانِ محبوب نے عاشق کو گرفتار کیا اور اس عشق کی بدولت اس کا گھر بھی برباد ہو گیا"۔ [1]

صغیر احسنی صاحب نے ابر صاحب کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اُن کی توجیہہ کے متعلق لکھا ہے:

"جو حضرات نفسیاتِ عشق و حسن سے نا آشنا ہیں۔ وہ یہاں "بیمار" کا قافیہ پسند کریں گے لیکن سلیم الطبع اور نفسیاتِ محبت سے آشنا حضرات "گرفتار" کا قافیہ ہی برمحل تصور کریں گے۔ ابر صاحب کا یہ کہنا درست ہے کہ چشمانِ محبوب دیکھنے والے کو گرفتارِ محبت بنا دیتی ہیں اور گرفتارِ محبت کا خانہ خراب کر دیتی ہیں" [2]

سیماب اکبر آبادی کے اعتراض اور ابر احسنی کے جواب کا جائزہ خاص طور پر دو نقادوں نے کافی شرح و بسط کے ساتھ لیا ہے۔ ایک شمس الرحمٰن فاروقی اور دوسرے عنوان چستی ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے بنیادی متن کو بنیاد بنا کر کچھ باتوں کی وضاحت کرنا چاہی ہے ملاحظہ ہو:

خاکسار اُس کی تو آنکھوں کے گھنے مت لگیو
مجھ کو ان خانہ خرابوں ہی نے بیمار کیا

اس پر میر نے ترمیم یوں کی "کہ مصرع اولیٰ علی حالہ رہنے دیا اور دوسرے مصرے میں بیمار کی جگہ گرفتار رکھ دیا

خاکسار اُس کی تو آنکھوں کے گھنے مت لگیو
مجھ کو ان خانہ خرابوں ہی نے گرفتار کیا

سیماب کہتے ہیں کہ اصلاح سمجھ کر نہیں دی گئی کیونکہ چشمِ محبوب کی رعایت سے "بیمار" ہی صحیح تھا۔ ابر احسنی کا جواب ہے کہ محبوب کی

---

[1] اصلاح الاصلاح ابر احسنی گنوری ص ۲۵

[2] صغیر احسنی بحوالہ ابر احسنی اور اصلاحِ سخن مرتب عنوان چستی نعیم الدین رضوی ص ۱۵۰

آنکھیں بیمار ہوتی ہیں نہ یہ کہ وہ ہر کسی کو بیمار کردیتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ چشمِ محبوب کو خانہ خراب اس لئے کہا کہ وہ عاشق کا خانۂ دل خراب کردیتی ہیں اور اکثر ایسا ہوا ہے کہ جس کی گرفتاری ہوتی ہے اس کا گھر بھی لوٹ لیتے ہیں۔

اس بات سے قطع نظر کہ سیمابؔ کا یہ فقرہ کہ ''اصلاح سمجھ کر نہیں دی گئی'' غیر ضروری اور غیر متین ہے۔ دونوں اساتذہ نے یہ بات نظر انداز کردی کہ جس چیز پر وہ بحث کررہے ہیں وہ میر کی باقاعدہ اصلاح نہیں ہے بلکہ نکات الشعراء کا ایک جملہ ہے۔ میر کسی وجہ سے خاکسار سے خفا ہیں۔ ان کا بُرا بھلا کہنے کے بعد لکھتے نہیں ہیں کہ ان کے یہ اشعار جو میں نقل کررہا ہوں ''فیضِ سخن'' کی وجہ سے ہیں۔ خاکسار کے نہیں ہیں۔ پھر زیر بحث شعر نقل کرکے کہتے ہیں۔ ''بر تتبع این فن پوشیدہ نیست کہ بجائے ''بیمار کیا، گرفتار کیا، می بایست''۔ ''دستور الاصلاح'' اس وقت سامنے نہیں اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ اس میں یہ شعر کس طرح درج ہے لیکن مصرع اولیٰ کا موجودہ متن صریحاً غلط ہے کیونکہ گھنے لگنا یا آنکھوں سے گھنے لگنا، کوئی محاورہ یا روزمرہ نہیں ممکن ہے یہ سہو کتابت ہو۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو سیمابؔ یا ابر یا دونوں کو اس طرف توجہ کرنا تھی محمود الٰہی نے ''آنکھوں کے کہے مت لگیو'' لکھا ہے جو بہت واضح نہیں ہے۔ لیکن موجودہ متن سے بہتر ہے۔ ممکن ہے کہ یہ کہے مت لگیو ہو۔ بہر حال ہی دو اساتذہ ان جھگڑوں میں نہیں پڑے۔ حالانکہ ان کا منصب اس کا متقاضی تھا۔
جہاں تک اصلاح کا سوال ہے مجھے مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ سیمابؔ نے اپنی رائے شعر کو سمجھ کر نہیں دی۔ انہوں نے سطحی رعایت کا تقاضا دیکھتے ہوئے محبوب کی آنکھ کے حوالے سے بیمار کو بہتر سمجھا ہے۔ ابر احسنی

''خانہ خراب'' کی معنویت کو سمجھ گئے لیکن انہوں نے بھی اِدھر اُدھر کی باتیں زیادہ بنائیں اور خانہ خراب یا گھر کو برباد کرنے والا کی مناسبت ''بیمار'' سے بالکل نہیں ہے اور گرفتار سے اس کی مناسبت واضح ہے اس وجہ سے نہیں کہ بقول ''ابر'' جس کی گرفتاری ہوتی ہے اس کا گھر بھی لوٹ لیتے ہیں، بلکہ اس وجہ سے کہ جو شخص گرفتار ہو گیا اس کا گھر تو برباد ہوگا ہی۔ جب گھر کا مالک یا گھر والا نہ ہوگا تو گھر اور اس کے دوسرے مکینوں پر خرابی ہی تو آئے گی۔ اگر اتنی دور تک نہ جائیں تو سامنے کی بات یہ ہے کہ آنکھوں کو خانۂ زنجیر سے مشابہت ہے۔ اس لئے ''گرفتار'' بیمار سے بہتر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میر کی ترمیم ان کی اُستادی کی دلیل ہے سیماب کا اعتراض بیجا اور ابر احسنی کا جواب سُست ہے''۔[1]

شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے جائزے میں اور باتوں کے علاوہ اختلافِ متن کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا ہے مگر نکات الشعراء کے قدیم نسخوں یا معاصر تذکروں سے استفادہ نہ کرنے کی وجہ سے ان کا فیصلہ یکطرفہ اور عاجلانہ ہے جس طرح فاروقی نے اس اصلاح کے کچھ نئے گوشے اُبھارنے کی کوشش کی ہے اُسی طرح عنوان چستی صاحب نے اپنے جائزے میں مزید کچھ نکات کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ملاحظہ ہو ان کا جائزہ:

''شمس الرحمٰن فاروقی نے اس پر ایک نئے انداز سے اظہار خیال کیا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ مصرع اولیٰ کا موجودہ متن صریحاً غلط ہے کیونکہ ''گھنے لگنا'' یا ''آنکھوں سے گھنے لگنا'' کوئی محاورہ یا روزمرہ نہیں۔ اس کی جگہ محمود الٰہی نے نکات الشعراء کے مرتب کی حیثیت سے ''آنکھوں کے کہے مت لگیو'' لکھا ہے۔ جو موجودہ متن سے بہتر

[1] شمس الرحمٰن فاروقی۔ شب خون۔ الٰہ آباد۔ ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۸۲ء ص ۸

ہے۔ فاروقی نے پھر اپنے قیاس کی بنیاد پر لکھا ہے کہ ''کے کہنے مت لگیو'' ہوگا۔ میرا خیال یہ ہے کہ '' گھنے مت لگیو'' اپنی جگہ درست ہے۔ یوپی کے مغربی اضلاع اور مضافاتِ دہلی ''میں گھنا'' کثرت اور زیادہ کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ جو آج بھی بول چال کی زبان میں مستعمل ہے۔ '' گھنے لگنا'' بمعنی زیادہ لگنا۔ محبوب کی آنکھوں سے زیادہ پیار کرنا۔ اُن کی محبت میں زیادہ گرفتار ہونا۔ خاکسار کے شعر میں میر نے ''بیمار'' کی جگہ جو '' گرفتار'' بنایا ہے وہ اسی لفظ '' گھنے کا منطقی نتیجہ ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اے خاکسار تو اپنے محبوب کی آنکھوں سے زیادہ نہ لگیو، ان سے زیادہ پیار مت کیجیو۔ کیونکہ یہ عاشق کو گرفتاری سے بچنا ہے تو آنکھوں سے زیادہ محبت نہ کرنا۔ اس لئے فاروقی صاحب کی رائے سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ '' گھنے لگیو'' صریحاً غلط ہے''۔ فاروقی صاحب نے لکھا ہے کہ گھنے لگیو محاورہ ہے نہ روزمرہ۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ہر فقرہ روزمرہ ہو یا محاورہ ہو۔ کیا تخلیقی زبان کا کوئی دوسرا عنصر یا حرف تخلیقی لفظ، ترکیب یا فقرہ نہیں ہوسکتا؟ محمود الٰہی صاحب نے '' گھنے مت لگیو'' کو '' کہنے مت لگیو'' بتایا ہے۔ اس سے بھی شعر کا مفہوم وہی نکلتا ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یعنی آنکھوں کے کہنے میں نہ آنا۔ اس کی باتوں میں نہ آنا ورنہ گرفتار ہو جاؤ گے لیکن فاروقی صاحب نے جو قیاسی تصحیح کی ہے اور لکھا کہ یہاں ''کے کہنے مت لگیو'' ہوگا تو یہ کسی طرح قابل قبول نہیں۔ ایک تو یہ '' کہنے مت لگیو'' کی بھونڈی شکل ہے ''کہے مت لگیو'' یا گھنے مت لگیو میں روانی اور فصاحت ہے وہ '' کے کہنے مت لگیو'' میں نہیں ہے اگرچہ ''ک کہے'' میں اتصالِ حروف سے ہلکا سا صوتی تاثر مجروح ہوتا ہے مگر فاروقی صاحب کے ''ک کہن'' میں تو یہ اتصالِ تناظر کی حد کو چھو

لیتا ہے۔ پھر اس ٹکڑے میں 'ک کہن' بنانے سے یے کا جس بُری طرح خون ہوتا ہے وہ بھی قابل غور ہے مجھے تسلیم ہے کہ ہندی کے حروفِ علت کو گرانا جائز ہے مگر ان کے گرانے سے صوتی تنافر پیدا ہو یا مصرع کی روانی، چستی اور فصاحت متاثر ہو وہاں اس کو معیوب ہی قرار دینا صحیح ہے۔ فاروقی صاحب نے بیمار پر گرفتار کو فوقیت دیتے ہوئے ایک دلیل تو ابر صاحب کی اپنائی ہے۔ ابر صاحب نے لکھا تھا کہ جس کی گرفتاری ہوتی ہے اس کا گھر بھی لوٹ لیتے ہیں۔ فاروقی صاحب نے اس دلیل کا انکار کرتے ہوئے اسی دلیل کو یہ لکھ کر قبول کیا ''کہ جو شخص گرفتار ہو گیا اس کا گھر تو برباد ہو گا ہی'' یہ الفاظ کا الٹ پھیر ہے۔ ورنہ بات وہی ہے۔ جو ابر صاحب نے لکھی ہے۔ انہوں نے دوسری دلیل یہ فراہم کی کہ آنکھوں کو حلقۂ زنجیر سے مشابہت ہے۔ اسلئے گرفتار بیمار سے بہتر ہے۔ یہ بھی دور کی کوڑی ہے لیکن کسی حد تک قابل قبول ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان مباحث میں مصرع کے دروبست پر کم سے کم غور کیا گیا ہے۔ مصرع ہے ؎

مجھ کو ان خانہ خرابوں نے ہی بیمار کیا

اس میں ''ی'' بُری طرح کھٹکتا ہے بلکہ حشو معلوم ہوتا ہے اور مصرع کی بندش کو سست کرتا ہے۔ میر کی اصلاح سے ایک طرف ''گھنے مت لگیو'' یا کہے مت لگیو کا جواز فراہم ہوتا ہے اور دوسری طرف مصرع میں روانی اور فصاحت پیدا ہوتی ہے۔ خانہ خرابوں کی مناسبت بھی گرفتار پر دلالت کرتی ہے اس لئے خاکستار کے شعر پر میر کی اصلاح درست ہے۔ سیماب اکبر آبادی کا اعتراض بیجا اور ابراحسنی کا جواب صحیح ہے مگر فاروقی صاحب کی دلیلیں محض تاویلیں ہیں''۔ [1]

---

[1] عنوان چستی۔ عروض اور فنی مسائل ص ۲۵۳۔۲۵۴

جب ہم شعر کے متن، اصلاح اور توجیہات پر سنجیدگی سے غور کرتے ہیں تو یہ نتیجہ اخذ کرنے میں آسانی ہوجاتی ہے کہ ابتدائی ماخذوں خصوصاً نکات الشعراء، تذکرہ شعراء اردو (میر حسن) مشاطۂ سخن (صفدر مرزا پوری) میں شعر کا جو متن مندرج ہے وہی اصلی اور معتبر متن مانا جائے گا۔ سیماب اکبر آبادی اور ان کے بعد کا متن نقلی اور غیر معتبر جب تک کہ کسی باوثوق ذرائع سے اسکی تردید نہیں ہوتی۔

اب سوال یہ بھی پیدا ہوسکتا ہے کہ عین ممکن ہے کہ میرؔ نے اس شعر کے متن میں تحریف کی ہوگی! اگر ایسا ہوتا تو میر حسن کا تذکرہ جو خاکسار اور میر کی زندگی میں ہی لکھا گیا تھا ضرور اس کی طرف اشارہ کرتا۔ اس طرح جب ہم اصل متن کی روشنی میں میر کی اصلاح کا جائزہ لیتے ہیں تو اُن کی اصلاح اور ان کی توجیہہ یکطرفہ اور برائے نام نظر آتی ہیں۔ کیونکہ مصرع اولیٰ کی بندش و ترتیب کو مدِ نظر رکھتے ہوئے دوسرے مصرع میں ''ہی'' حرفِ تاکید کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ معشوق کی آنکھوں کا مذکور ہے اس لئے مضمون، بندش، ترتیب اور وزن شعر کی مناسبت سے ''بیمار'' صحیح اور برمحل لفظ استعمال ہوا چونکہ سیماب وغیرہ اصلی متن کا تعین نہیں کر سکے ہیں اسی وجہ سے وہ صحیح اور برمحل استعمال ہوا چونکہ سیماب وغیرہ اصلی متن کا تعین نہیں کر سکے ہیں اسی وجہ سے وہ صحیح نتیجہ اخذ کرنے سے قاصر رہے ہیں اور جس طرح میر نے مرزا جان جاں مظہر کے گروہ کے خلاف رواروی میں سرسری اور بے دلیل فیصلے صادر کئے ہیں اسی طرح سیماب اور بعد کے ارباب نقد و نظر نے زیر بحث شعر کے ساتھ یہی سلوک روا رکھا ہے۔

ایک اور بات جسکی طرف اشارہ کرنا حسب موقع ضروری معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ چونکہ میر نے اپنا تذکرہ اُس زمانے میں لکھا جب میر جنون زدہ تھے اسی وجہ سے انکے اسلوب اور اظہار بیان میں انتہا پسندی اور غیر مطابقت پائی جاتی ہے چاہے وہ خان آرزو کا گروہِ شعراء ہو یا مرزا جان جاں مظہر کا گروہ۔ اس وجہ سے میر کی اصلاحیں اور اعتراضات برائے نام غیر سنجیدہ اور استدلال سے خالی نظر آتی ہیں۔

●□●

غزلیں

بجھے ہوئے دل کی آس تھا میں
وہاں بہ حد قیاس تھا میں
غموں کے موسم گزر چکے تھے
نہ جانے پھر کیوں اُداس تھا میں

اسی سبب سے میں جنگ جیتا
یہی کہ موقع شناس تھا میں
عجب طرح سے ہوا ہوں خالی
چھلکتی مئے کا گلاس تھا میں

گھروں میں دُھند آرہی تھی پیہم
اِسی سبب بدحواس تھا میں
تھا دھوپ صحرا کنارِ دریا
جہاں پہ آکل بے لباس تھا میں

اِسی لئے ہونٹ سی لئے تھے
سخن بے ہراس تھا میں
تھا آنِ واحد کا قرب لیکن
یہاں سراپا سپاس تھا میں

دشا دشا میں بکھر رہا تھا
کہ اپنے ہی آس پاس تھا میں
بنا ہوا تھا میں بے تکلف
چھپائے اندر کی پیاس تھا میں

○

اک معمّے کی ہوئی نشو و نما پانی پر
کر گیا ہوں میں رقم حرفِ وفا پانی پر
میری تو پیاس بجھے گی ترا کیا جائے گا
والیِ آب نہ یوں دل کو دکھا پانی پر
بارہا آگ پلائی گئی پھولوں کو یہاں
بارہا کاٹے گئے دستِ صبا پانی پر
یاد کے گہرے سمندر میں نہ ڈالو پتھر
دائرے کھینچتی ہے موجِ ہوا پانی پر
تیرنے والے کہاں دیکھتے ہیں موجوں کو
فیصلہ چھوڑتے ہیں اچھا برا پانی پر
کاغذی ناؤ پہ کیا پار اُتارے گی فرید
خود کو نادان تماشا نہ بنا پانی پر

اُن کی شمع جلا دور ہر شکایت کر
فسردہ دل ہوں میں پوری مری ضرورت کر
وہ بات کرنے لگا مجھ سے میرے لہجے میں
گھما پھرا کے یہ کہتا ہے اب محبت کر
کوئی ہے جس نے یہاں ہار ہی نہیں مانی
کہانی میری سُنا اور محو حیرت کر
سکھا رہا ہے ہنر نفیِ ذات کا مجھ کو
وہ ایک شخص جو کہتا تھا کل بغاوت کر
یہ موڑ کاٹ کے پھر زندگی سے ملنا ہے
اس ایک بات پہ آمادہ اب طبیعت کر
مرے چراغ کو دوشِ ہوا پہ رکھ کے نہ جا
نہ اس طرح مری محنت کو اب اکارت کر
غموں کا بوجھ وہی رکھ رہا ہے شانوں پر
جو کل تلک مجھے کہتا تھا عیش و عشرت کر
یہ کون مجھ سے خفا ہو رہا ہے میری طرح
اِسے تو سایہ سمجھ وہم سے عبارت کر
یہاں ہیں چاند ستارے بھی گردشوں کے اسیر
کوئی نہ تیرا بنے گا ہزار محنت کر
خموش رہنا یہاں پر ہے بزدلی کی دلیل
ستم گری کو ذرا موردِ شکایت کر

مرے چراغ کو طاقِ زیاں پہ رکھتا ہے
جہاں اندھیرا نہیں ہے وہاں پہ رکھتا ہے
میں نیم جان رہوں یا کہ جاں گسل اُسے کیا
یہ انحصار وہ تیر و کماں پہ رکھتا ہے
جنوں کے کام وہ کارِ سہل کہتا ہے
عجب گمان وہ کارِ جہاں پہ رکھتا ہے
ہوا کے ہاتھ میں دے کر گیا وہ میرا ہاتھ
وہ اس طرح بھی مجھے امتحاں پہ رکھتا ہے
چُرا کے رنگ وہ چہرے کا، جسم مانگتا ہے
بہت سے قرضے مری نقدِ جاں پہ رکھتا ہے
بدلتا جاتا ہے وہ گام گام راہ اپنی
وہیں پہ مجھ کو ہے رُکنا جہاں پہ رکھتا ہے
یہی کہ چھوڑ گیا تنگنائے دنیا میں
وہی جو اپنا مکاں لامکاں پہ رکھتا ہے
میں اُس کو بھول بھی جاؤں تو کس طرح جو فرید
بنائے قربِ غم جاوداں پہ رکھتا ہے

سکوتِ مرگ نہ شورِ ثبات سے مجھ کو
ملا رہا ہے کوئی میری ذات سے مجھ کو

تقاضہ اس کے سلجھنے کا دن کرے گا ضرور
ہے ایک مسئلہ درپیش رات سے مجھ کو

وہ کوئی دوست ہے میرا کہ دشمنِ جانی
ڈرا رہا ہے جو آبِ حیات سے مجھ کو

بہت دنوں سے کوئی خواب بھی نہیں آتا
چھڑا کے کون گیا ممکنات سے مجھ کو

جو میری راہ میں آسانیاں بچھاتا تھا
دوچار کرتا ہے کیوں مشکلات سے مجھ کو

تمہارے بارے میں چھوڑا ہے سوچنا میں نے
رہا نہ اُنس کوئی شش جہات سے مجھ کو

سخن سخن کھلاتا ہے پھول جو اکثر
ہوا ہے رنج بہت اس کی بات سے مجھ کو

جو نقدِ جاں کی طلب ہو تو شوق سے دے دوں
نواز دینا وفا کی زکات سے مجھ کو

کوئی پیام گلوں کا نہ خوشبوؤں کی خبر
ملا نہ کچھ بھی صبا تیرے ہات سے مجھ کو

خواب اور طرح کے ہیں خیال اور طرح کے
آنکھیں ہیں وہی اُن میں سوال اور طرح کے

اپنے سے جدا ہو کے بھی زندہ ہیں یہاں لوگ
اس شہرِ فسوں کے ہیں کمال اور طرح کے

قامت ہے جہاں پست وہیں سایہ ہے بالا
قسمت میں لکھے اب کے زوال اور طرح کے

وہ دن گئے ہوتی تھی فرومایۂ کلفت
موسم ہیں نئے اور ہیں ملال اور طرح کے

آسودۂ امکانِ طرب دل ہی نہیں ہے
جاری ہیں یہاں کربِ وصال اور طرح کے

ملنے کو تو ملتے ہیں مگر دل نہیں ملتا
رشتے ہوئے ہیں اب کے بحال اور طرح کے

کل تک جو محافظ تھے وہی اب ہیں مخالف
برپا ہیں یہاں جنگ و جدال اور طرح کے

OO

پہلے پوچھا جو نہیں تھا وہی سب پوچھتی ہے
زندگی رات سے جینے کا سبب پوچھتی ہے
سایۂ تاک میں کتنی ہوئی کم تلخیٔ غم
اور کیا اِس کے سوا بنتِ عنب پوچھتی ہے
فہم و ادراک سے بالا ہے چلن دنیا کا
ہارنے والے سے یہ جیت کا ڈھب پوچھتی ہے
رنگ رخ، قربت جاں کچھ بھی نہیں پاس مگر
حاصلِ صحبتِ شب صبح طرب پوچھتی ہے
عشق میں عزتِ سادات گئی کیا اِس کا غم
دل کی نسبت نہ کبھی نام ونسب پوچھتی ہے
چاند کی پہلی کرن پوچھنے آتی ہے حال
جب یہاں کوئی نہیں ہوتا ہے تب پوچھتی ہے
اس طرح پہلے کبھی بام نہ در بجتا تھا
آج کیا بات ہے یہ رونقِ شب پوچھتی ہے
پہلے پوچھا ہی نہیں دل کے دھڑکنے کا سبب
کشتیاں ڈوب کے کیا موجِ غضب پوچھتی ہے
دل کی وسعت کے لئے چاند ستارے کم ہیں
اکتفا کس پہ کروں میری طلب پوچھتی ہے۔

شکیب و صبر پہ میں انحصار کر نہ سکا
طریقِ غیر کبھی اختیار کر نہ سکا

میں جانتا ہوں تغیّر ہے زندگی کی دلیل
اِسی سبب سے ترا انتظار کر نہ سکا

میں سیرتوں کا ہمیشہ رہا ہوں شیدائی
میں صورتوں سے کسی وقت پیار کر نہ سکا

تمام عمر خریدے ہیں اور بیچے خواب
علاوہ اِس کے کوئی کاروبار کر نہ سکا

کچل کے چلتا ہے جذبات بے طرح سب کے
کسی بھی رشتے کو وہ اُستوار کر نہ سکا

وہ درمیان کی راہ اختیار کیا کرتا
جو امتیازِ یمین و یُسار کر نہ سکا

گلے لگائے گا وہ شخص کیسے غیروں کو
کبھی جو اپنوں پہ بھی اعتبار کر نہ سکا

مرا ضمیر گوارا نہ کرسکا اس کو
تو یہ خیال نہ کر تجھ پہ وار کر نہ سکا

گھروں کی دوریاں کم کر گیا ضرور مگر
دلوں کی دوریاں کم نئے سوار کر نہ سکا

تھا ابتدا سے فرید انتہاء پسند مزاج
وہ اعتدال کو اپنا شعار کر نہ سکا

آشوبِ آگہی سے کنارا نہیں کیا
اک بار کر چکا ہوں دوبارا نہیں کیا
خود سے کبھی بچھڑنے نہ آپ اپنے کو دیا
اس طرح ہم نے اپنا خسارا نہیں کیا
ہوں سطح بیں ہمیشہ رہا منظروں میں قید
لیکن کسی کو آنکھ کا تارا نہیں کیا
آسائشِ بدن نہ میّسر کہیں ہوئی
سایوں نے کوئی کام ہمارا نہیں کیا
اُن منظروں کو دیکھنے کی تاب ہی نہ تھی
ایسا نہیں کہ میں نے نظارا نہیں کیا
اتنا میں جانتا ہوں بہت ہی اُداس ہوں
پر بے دلی سے میں نے اشارا نہیں کیا
پنپا نہ کوئی خواب ہی بنجر نگاہ میں
کیا کہ تیرا ساتھ گوارا نہیں کیا
تکمیل کی خلش ہے مرے دل میں موجزن
اس مرحلے میں تجھ کو سہارا نہیں کیا
لڑنا ہی اپنے آپ سے مصرف ٹھہر گیا
میں نے پرائے غم پہ گزارا نہیں کیا

کر رہے ہیں آپ اپنی جستجو مَیں اور ہَوا
ایک جا ہو جائیں گے شاید کبھو مَیں اور ہَوا

آئے گی فرصت میّسر دونوں کو شاید کبھی
کرہی لیں گے دیر تک پھر گفتگو، مَیں اور ہَوا

بھر گئی ہے دُھند ذہنوں میں دیارِ غیر کی
بے سبب پھرتے نہیں ہیں کو بکو، مَیں اور ہَوا

ایک سا رہتا ہمیشہ ہی نہیں اپنا مزاج
ہیں ملائم اور کبھی ہیں تندخو، مَیں اور ہَوا

جا بجا سرگوشیاں کرنے لگیں پرچھائیں
گھر سے باہر جب کبھی نکلے ہیں، تو مَیں اور ہَوا

دل لرز اُٹھتا ہے اکثر اس گماں پر بے طرح
پیش ہو جائیں گے اک دن رو برو مَیں اور ہَوا

بانٹ کر آپس میں کوچے اور گلیاں' شہر کی
توڑ دیں گے نفرتوں کا بو میں اور ہوا

انفرادی سوچ آخر کر گئی تنہا فریدؔ
ہوگئے بیگانۂ ہر رنگ و بو مَیں، اور ہَوا

ہر گھنے سائے کو بے نام ونشاں کرتا ہوا
وقت گزُرا خواب میرے رائیگاں کرتا ہوا

کون آتا ہے مری راتوں کو کرنے معتبر
کون جاتا ہے مری شمعیں دھواں کرتا ہوا

اُس نے ہنستے کھیلتے پھاندی ہے دیوارِ یقیں
میں کہ خود کو پھر رہا ہوں خوش گماں کرتا ہوا

کیا بتاؤں کس طرح پیش آئی مجھ سے زندگی
سو نہ جاؤں میں یہی قصہ بیاں کرتا ہوا

میری بستی سے ہے گزرا ایک لشکر اِس طرح
دودھ پیتے بچوں پر مشقِ سناں کرتا ہوں

سہہ رہا ہوں دیر سے لاسمتیت کا اک عذاب
کٹ گیا اپنوں سے خود کو آسماں کرتا ہوا

کھو گئے گاڑھے دھویں میں شہر کے منظر تمام
اک پرندہ رہ گیا آہ وفغاں کرتا ہوا

کس نے رکھی ہے میری آنکھوں میں خوابوں کی قطار
کون خواہش دل کی جاتا ہے جواں کرتا ہوا

ترے بغیر بھی جی لوں ارادہ تھا پہلے
ذرا یہ سوچ کہ میں کتنا سادہ تھا پہلے

اسی زمیں نے دیئے جور کے جلائے بہت
اِسی زمیں سے تعلق زیادہ تھا پہلے

وہیں پہ اب بھی کھڑا ہوں میں ساکت وجامد
جس ایک راہ پہ میں اِیستادہ تھا پہلے

اسی مکاں میں گھٹن ہو رہی ہے اب محسوس
یہی مکان بہت ہی کشادہ تھا پہلے

چمک دمک وہ مری اپنے ساتھ لے کے گیا
چمکتا جسم دمکتا لبادہ تھا پہلے

وہ ایک بات جو باعث ہوئی تعلق کی
اُس ایک بات کا کرنا اعادہ تھا پہلے

محبتوں کے دیئے میں جلا کے سو جاؤں
مرا خیال نہیں یہ ارادہ تھا پہلے

فریدؔ کرتا تعین میں کیسے راستے کا
نہ منزلیں تھیں یہاں اور نہ جادہ تھا پہلے

اور کیا اِس کے سوا اہل نظر جانتے ہیں
پگڑیاں اپنی بچانے کے ہنر جانتے ہیں

اک ستارے کو ضیا بار دکھانے کے لئے
وہ بجھائیں گے سبھی شمس وقمر جانتے ہیں

اس طرح بھاگتے سایوں پہ نظر رہتی ہے
کام آتا ہے بہت روزنِ در جانتے ہیں

خواب میں دیکھتے ہیں کھڑکیاں ہر گھر کی کھلیں
دور ہوجائے گا اب شہر سے ڈر جانتے ہیں

کسی جھولی میں یہ تارے ہی نہیں گرنے کے
یہ طلب گار کا اندازِ نظر جانتے ہیں

روشنی غیر کی ہوتی ہے چکاچوند بہت
ہم اِسے کچھ بھی نہ جز رقصِ شرر جانتے ہیں

میزبانی تھی کبھی جن میں میسر تیری
لوٹ آئیں گے وہ شام وسحر جانتے ہیں

خوابوں کا اک ہجوم شکیبائی لے گیا
چھوڑا مجھے مگر مری تنہائی لے گیا

پہچان اپنے آپ کو پاؤں میں کس طرح
یہ دور مجھ سے میری شناسائی لے گیا

مٹی کی سب امانتیں مٹی کو سونپ دیں
اک گھر بچا تھا وہ بھی مرا بھائی لے گیا

میں کر رہا ہوں کل سے اشاروں میں گفتگو
یہ کون مجھ سے قوتِ گویائی لے گیا

وسعت سڑک میں دے کر وہ رونق بڑھا گیا
لیکن مرے مکان کی انگنائی لے گیا

کیف زا لمحوں کی مجھ میں اب للک باقی نہیں
میں تو ہوں لیکن وہ پہلی سی کسک باقی نہیں

ایک مدت سے نہ رکھا میں نے پٹھے پر ہے بات
کیا کوئی چکّر بھی اب دورِ فلک باقی نہیں

رونقِ دنیا ہے باقی میں ہی لیکن بجھ گیا
چاند ہے بھر پور تارے میں چمک باقی نہیں

میں بھلا بیٹھا ہوں ہنستے بولتے لمحوں کی یاد
تجھ میں بھی شاید یہ قدرِ مشترک باقی نہیں

دل کا رشتہ یاد سے ٹوٹا ہے مدّت ہوگئی
پھول باقی ہے مگر اِس میں مہک باقی نہیں

پھر پرائی آگ میں جلنے لگا میرا وجود
یہ دھواں پھیلے گا گھر گھر اس میں شک باقی نہیں

گھورتے ہیں لوگ کیوں پر چھائیوں کو اِس طرح
شاید اُن کے پاس خوابوں کی جھلک باقی نہیں

حظ اُٹھا سکتے نہیں ثقل سماعت کے سبب
کہہ رہے ہیں پھر بھی باتوں میں نمک باقی نہیں

میں ہوا بے رنگ موسم کے سبب یا اب فریدؔ
قرب کے بے لوث لمحوں کی دھنک باقی نہیں

قدم قدم پہ دیئے شوق کے جلا کے چلے
ہمیں وہ لوگ ہیں جو اپنا سر اُٹھا کے چلے

نہ راس آئیں انہیں خوش گمانیاں میری
اِسی لئے وہ یہاں آئینے سجا کے چلے

مَیں تیر کھاتا ہوں اور آہ بھی نہیں کرتا
وہ اِس طرح سے مرے حوصلے بڑھا کے چلے

وہی ہیں نوحہ کُناں آج میرے ماتم میں
یہی ہیں کل جو مجھے کربلا میں لا کے چلے

کسی کے جور و ستم یاد جو نہیں رکھتے
ہم اُن ہی لوگوں سے اب سلسلہ ملا کے چلے

جہاں پہ روز ہَوا سائیں سائیں کرتی ہے
اُس ایک دشت کا مجھ کو پتہ بتا کے چلے

تسلسل ٹوٹتے خوابوں میں پیدا کر گئی دُنیا
نئے انداز سے شعلے نگہ میں بھر گئی دُنیا

مری عجلت پسندی نے ہی پل پل رُخ بدل ڈالا
اِسی رستے پہ ورنہ ساتھ میں اکثر گئی دُنیا

خمیدہ پشت پر اک لاش لیکر اپنے ہونے کی
کوئی پہچان نہیں پایا یہاں گھر گھر گئی دُنیا

نظر انداز کرتا ہوں میں دنیا کارِ دنیا بھی
یہ کیوں اپنا بنانے کا تقاضا کر گئی دُنیا

تمہارے بعد اب کُھبتا نہیں ہے کوئی نظروں میں
چلو اتنا تو اچھا کام آخر کر گئی دُنیا

مجھے دنیا کی فکروں سے کیا آزاد اپنوں نے
یہ کس انداز سے آخر کُتر کر پر گئی دنیا

مرا ہونا نہ ہونا ایک سا ہے اُس کی نظروں میں
سلیقے سے الگ کر کے ہر اک منظر گئی دُنیا

رباعیاں

واقف میں ہر اک خواب کی تعبیر سے ہوں
میں حسن ہوں اور حسن کی جاگیر سے ہوں
کہتے ہیں مجھے یوسفِ ثانی اے دوست
کنعاں سے نہیں وادیٔ کشمیر سے ہوں

○

خاشاک وجود ایک بھنور میں رہتا
اے بے خبری اپنی خبر میں رہتا
سانسوں نے نہیں چھوڑی وظیفہ خوانی
مصروف میں کیا کارِ دگر میں رہتا

○

تحلیل کے امکان سے ڈر جاتا ہوں
بے سمت منازل سے گزر جاتا ہوں
باندھی یہ ہوا پیٹھ پہ میری کس نے
رُکتا ہوں کہیں پر نہ ٹھہر جاتا ہوں

○

تلخابۂ دنیا بھی مزا دیتا ہے
جینے کیلئے طرزِ ادا دیتا ہے
صحرائے لق و دق میں بٹھانے والا
زمزم سے مری پیاس بجھا دیتا ہے

○

بے کیف شب و روز کو اچھا کر دے
ارمان مرا اب کے یہ پورا کر دے
ہیں موت کے سامان یہاں چاروں طرف
اب زیست کے سامان مہیا کر دے

○

جذبات کی دنیا ہوں برنائی ہوں
آپ اپنی اداؤں کا تماشائی ہوں
آ حسن کی دنیا کر اب میرا طواف
بھرپور جوانی ہوں رعنائی ہوں

○

ہر ایک عمل ردِّ عمل رکھتا ہے
ہر اچھا بُرا اپنا بدل رکھتا ہے
بیٹھا ہوں اُسی پیڑ کے سائے کے تلے
جو پیڑ نہ ہی پھول نہ پھل رکھتا ہے

○

سینے پہ لئے سنگ گراں ، ہوں میں بھی
اور اُسکی طلب میں خوں فشاں ہوں میں بھی
رنگوں کے تعاقب میں وہ ہے سر گرداں
خوابوں کی بس اک دُھن میں رواں ہوں میں بھی

○

ہے چاند کے ہاتھوں میں پھریرا لیکن
آنکھوں میں ہے رنگوں کا بسیرا لیکن
ہر چیز میسر ہے بفضلِ مولیٰ
اک ساتھ میسر نہیں تیرا لیکن

تاریکی میں مصلوب رہا ہے سورج
طالب کبھی مطلوب رہا ہے سورج
بڑھنے لگے اس درجہ پرائے سائے
مٹکے میں یہاں ڈوب رہا ہے سورج

ہر سایہ بغل گیر نہیں ہوسکتا
یا پاؤں کی زنجیر نہیں ہوسکتا
میرا وہ نہیں ہوتا مرا ہو کر بھی
گھر ریت پہ تعمیر نہیں ہوسکتا

خوابوں کی رقابت ہے کہاں تک جاؤں
اب کیسے بھلا اپنے مکاں تک جاؤں
اپنے ہی تعاقب میں ہوں میں سرگرداں
اس گنبدِ بے در میں جہاں تک جاؤں

کم کوش، سبک بار کہے جاتے ہیں
میں قند پہ تلوار کہے جاتے ہیں
دوں رائے حدیں پھاند لوں یہ ٹھیک نہیں
مجبور ہیں مختار کئے جاتے ہیں

○

اس جہد مسلسل کا یہ حاصل بھی ہے
اے ڈوبنے والے یہی ساحل بھی ہے
پر آپ کو میں کر کے دکھانا چاہوں
آسان ہے یہ کام پہ مشکل بھی ہے

○

لمحاتِ گریزاں کو سمٹ کر دیکھا
اور عصر رواں سے بھی کٹ کر دیکھا
یادوں کی اذیت ہی فقط ہاتھ آئی
ماضی کی طرف جب بھی پلٹ کر دیکھا

○

ہر سمت سے ہوں میں ہی ہدف یامولیٰ
ہے سنگ زنی چاروں طرف یامولیٰ
ہے کون مددگار مرا تیرے سوا
ہر شخص ہے شمشیر بکف یامولیٰ

○

بڑھتا ہے اب احساس زیاں روز بروز
جلتا ہے اِک آسودہ مکاں روز بروز
بدلا ہے چمن بدلا ہے گلچیں کا مزاج
خوابوں کا یاں اڑتا ہے دھواں روز بروز

سانچے میں نئے وقت کی ڈھل جاتی ہے
چلتے چلتے رستہ بدل جاتی ہے
بچپن ہو ، لڑکپن ہو ، جوانی ہو کہ زیست
ہاتھوں سے ہر اِک چیز نکل جاتی ہے

اِک رنگ شکستہ ہی صانع ہوتا
یاں جہد مسلسل میں یہ مانع ہوتا
بجھ کے رہ جاتی مری شورہ طلبی
میں موت یہ یازیست پہ قانع ہوتا

اُڑتے ہوئے لمحات کی گردش اور میں
موہوم خیالات کی لرزش اور میں
رفتار ہے کج ، پائے طلب کی شاید
بے سود شب و روز کی ورزش اور میں

آپ اپنے سے لڑتا ہوں ، پاگل کی طرح
ہاں کام ملا ، جہاد مسلسل کی طرح
ہوں پیاسی زمینوں کا طلبگار فرید
گردش ہے مرے پاؤں میں بادل کی طرح

○

دنیا کو نیا طور سکھانا چاہوں
چاہت کسے کہتے ہیں ، بتانا چاہوں
خواہش ہے کروں عشق میں اور ایسا عشق
جس عشق میں ہر شئے کو بھلانا چاہوں

○

پھولوں سے چُرا کر وہ مہک بھیجتا ہے
آکاش کی خوش رنگ دھنک بھیجتا ہے
خالی نہیں رہ سکتا ہوں وہ جانتا ہے
زخموں کے لئے تازہ نمک بھیجتا ہے

○

قائم رکھیں آسودہ مکاں ، ہم دونوں
اک دوبے پر ہوں مہرباں ، ہم دونوں
چلتا رہے ہمراہ شراب اور کباب
اے کاش رہیں یونہی جواں ہم دونوں

○

برباد ہوا صحنِ چمن رقص میں ہوں
ویرانہ بنا اپنا وطن رقص میں ہوں
باقی نہیں ارتباطِ روح و تن اب کے
رہبر ہے بہ شکلِ راہزن رقص میں ہوں

○

پرشور کبھی ظلم کے بازار میں ہوں
اور رقص کناں حسن کے دربار میں ہوں
پستی ہے مگر وقت کی چکی مجھ کو
ہاں تیز قدم وادیٔ پُرخار میں ہوں

○

شیرازہ محبت کا پریشان ہوا
غارت عیش و سکون کا سامان ہوا
اُس دور میں جیتا ہوں کہ جس میں انسان
وحشی و درندہ اور حیوان ہوا

○

طوفان حوادث میں بکھرتا ہے وجود
اک آگ کے دریا سے گزرتا ہے وجود
ہے غول بیاباں کا تعاقب شب و روز
اس تیرہ خاک داں میں ڈرتا ہے وجود

○

رومی ہوں نہ رازی ہوں نہ خیام و سعید
ہوں ذرا ناچیز کہ ہے نام فرید
قدرت سے تری اُٹھتا ہے صحرا میں حباب
ذروں سے اگا دیتا ہے لاکھوں خورشید

○

مفہوم طلب غرض نہ غایت ہوگی
جز ایں کہ پذیرائی کلفت ہوگی
انصاف کے والی یہ ذرا بتلا کب
بے جرم اسیروں کی سماعت ہوگی

○

کندن سا کھٹالی میں پگھل جاتا ہوں
چھو جائے صبا رنگ بدل جاتا ہوں
دہکایا ہے آشوب زمانہ نے جسے
ہر وقت اسی آگ میں جل جاتا ہوں

○

ہوں مملکت مصر سے محروم ابھی
پتھر کے تلے ہے مرا مقسوم ابھی
یوسف کی طرح اندھے کنوئیں میں ہوں پڑا
ہر خواب کی تعبیر ہے موہوم ابھی

○

پیدا پہ یہاں شور ہے پنہاں پہ شغب
جینے کا نہ مقصود نہ مرنے کا سبب
اک بوجھ لئے پھرتا ہے سر پر آدم
دنیا کی تمنا ہو کہ عقبیٰ کی طلب

○

حالات کی چھلنی میں اسے چھان لیا
ہاں زیست کو ہر رنگ میں پہچان لیا
گر آب بقا بھی ہو نہ میں منہ کو لگاؤں
یہ ٹھان لیا، ٹھان لیا ، ٹھان لیا

○

بے آب کبھی ہجر کی شمشیر بھی ہوگی
پیدا کہ ہر اک نالہ میں تاثیر بھی ہوگی
اک دن کہ تفاوت کی یہ دیوار گرے گی
شرمندہ اس اک خواب کی تعبیر بھی ہوگی

○

ہر لحظہ نئے سانچے میں ڈھلتی ہے یاد
ناگن کی طرح دودھ میں پلتی ہے یاد
خوشبو کی طرح پھیلتی ہے نس نس میں
صندل کے تلے پھولتی پھلتی ہے یاد

○

شہر آشوب

ملال و رنج کی باتیں بہت ہوئیں اب تک
چلو بدل کے چلیں اب کے گفتگو کا مزاج
سوال کرتی ہوئی ساعتوں سے بچ کے چلیں
جواب دیتے ہوئے راستوں سے لیں گے خراج
چلو چلیں گے کسی سیر گاہ کی جانب
جہاں پہ ہوگا میسّر ہجوم مہروشاں
وہی پہ بات کریں گے جلا کے شمع خیال
خلوص وشوق کا موسم یہاں رہے گا جوان

بہار آئی ہر اک شاخ ہے ترو تازہ
نمو پذیر ہے روئے حیات پر غازہ
چمن سے آیا ہے گلگشتگی کا اک فرماں
خیال و خواب کا موسم سدا رہے گا جواں
چلے بھی آؤ کہ نغمہ بھی ہے نگار بھی ہے
گلاب و لالہ کے چہرے پہ کچھ نکھار بھی ہے
شجر شجر ہے معطّر کلی کلی مدہوش
ہر ایک شاخ لئے جامِ انگبیں ہے کھڑی
روش روش ہے گلستاں قدم قدم ہے ختن

ملال و رنج کی باتیں بہت ہوئیں اب تک
چلو بدل کے چلیں اب کے گفتگو کا مزاج
نہ اِس کا ذکر کریں اب یہاں پہ کیا گزری
نہ اِس کا ذکر کریں کٹ مرے ہیں کتنے جواں
نہ اِس کا ذکر کریں دن ہیں چھوٹے رات بڑی
وطن ہے اپنا یقیناً مثالِ خلد بریں
کہیں نہ اِس کا ہے ہم سر نہ اِس کا ثانی کہیں
چلی ہے جو رو جفا کی یہاں پہ ایسی ہَوا
یقین ہوگیا موہوم اور گماں مدقوق
سروں پہ کب سے مسلّط ہے تیرگی کی غُبار
متاعِ صبر و سکوں کے نشاں ہوئے دھندلے
سلاح و تیغ ہے کب سے نیام سے باہر
کہیں پہ اب نہ اُجالا اُداس ہے گھر گھر
برستے سنگ فلاخن سے گرچہ شام و پگاہ
فغاں کرنا یہاں جرم آہ بھرنی گناہ
''یہ اور بات ہمارے لہو کی پیاسی ہے
مگر زمینِ وطن پھر بھی ہے زمینِ وطن''
ملال و رنج کی باتیں بہت ہوئیں اب تک
چلو بدل کے چلیں اب کے گفتگو کا مزاج

نہ اِس کا ذکر کریں گے شقی ہیں اہلِ وطن
نہ اِس کا ذکر کریں گے کہ تنگ ہیں اوقات
زمانہ تارِ حریر دو رنگ کی مانند
زمانہ مرد تہی دَست ، سنگ کی مانند
اس ایک بات پہ کیا زندگی حرام کریں

میں کب کا بھول چکا اپنے دوستوں کا سلوک
میں کب کا بھول چکا ہوں وفا کی راہ گزر
یہاں پہ کون کہے گا ٹھہر ٹھہر کے چل
میں کب کا بھول چکا دل نشیں ہر اک ساعت
وہ قربتوں کا درخشاں شفیق موسم بھی
رفاقتوں کا اُجالا خوشی کی رِم جھم بھی
ملال و رنج کی باتیں بہت ہوئیں اب تک
چلو بدل کے چلیں اب کے گفتگو کا مزاج

تری طرف جو کبھی غیر کی نظر اُٹھتی
مری وفائیں اُسے نوچ کھانے کو مچلیں
ہوا ہے روزنِ ماہِ تمام بے رونق
رہا نہ یاد وہ چاہت کا بھیگتا موسم
رُکے تھے کتنے ہی لمحوں کو جاوداں کرلیں
چلے کہ عزم تھا دامن ترا نہ چھوڑیں گے

مگر چلی ہے یہاں تیز تیز اک آندھی
اُجاڑ ہو گئے راستے محال ہوگئی زیست

شبہہ خواب نگاہوں میں لے کے پھرتا ہوں
کہیں نہ وقت کی آندھی اِسے بھی گل کردے
تصوّرات کی پرچھائیوں میں جیتا ہوں
میں جینا چاہتا ہوں پھر بھی زہر پیتا ہوں
وہ خواب خواب گزر گہہ وہ دل نشیں موسم
جہاں سے کی تھی محبّت کی ابتداء ہم نے
قدم قدم پہ تمنّائیں دم بہ خود ہیں یاں
تلاش کرتا ہوں کب سے وہ دلنشیں ساعت
وہ خوشبوؤں سے نکھرتا ہوا بدن اُس کا
میں واہموں میں گرفتار ہوگیا اِتنا
یہ سوچتا ہوں کوئی لمحہ جاوداں ہی نہیں
یہاں پہ مانگئے کس سے سکون کی خیرات
یہاں کروں گا اب اپنے سوا میں کس سے بات
میں خود ہی آنکھ ہوں خود ہی قدم ہوں خود ہی ہات
ہر اک سوال کہ ریگ رواں کی مانند ہے
ہر ایک سلسلہ وہم و گماں کی مانند

●□●

Moon & stars do not suffice !
Not moderation
But extreme disposition becomes his forte!
Ironically thinking for others
Either talking of Peace & Purity
Or of fight to be getting adjusted into!
In union or separation of beloved
Imprisoned by the permanency of
Love ...
Love that is offered
Dal pamposh draws close of fulfillment of Destiny.
Soul sustains courage.
Still moon & stars seen to be in line!
A shimmering clayey lamp
Makes him to remember
Something of mortality - to clay everything returns
Soul in search of fresh gales of wind;
Apprehensive of scarching gales of wind
When acquaintance was dissolved long lake
Rules out identification
Whomhave written wrongly on the door: Desolated descendant
made the house!
In the city of whimsicals
Where everyone dying by inches!!
Moonlight might resplends throughout,
But no sparkling glow in stars
Like glow worm he merges
One bird left in the cityscape : Since
That sighs & Sols !
Where people celebrate killing
No sympathiser to mourn in
Supplicating hands before Allah:
With humility in Makhdoom Sahib's court :
Oh ! Hazrat Sultan-ul-Arifeen (RA)
Wishing to cast a mystical eye over wounded paradise:
Too much sadness & afflicted heart discussed.
Lo! We will change tone of conversation
Let us go to any !andscape
Where dignity & delight prevail
We will discuss there of love & light
For sincerity & love
Climate remains young
The land, where in our birth happened !!

I ought to live life again yet sipping poison;
That very dreamy, that sensual beloved season-
Where from started love affair;
Step by step yearnings found to be
dumb stricken here.

❐♦❐

Till now much conversed of displaceable distress
Let us now have tune of conversation changed !
Since long in quest beloved time;
That fragrant gushes of wind;
Thought it as there is no eternal moment
Now the age turned contrary to, else
constraints in its time
To when thou ask for peace of mind?
Am I myself only eye, foot, hand.
Every support looks as scattering sand !
Every action as whimsically superstions moment
To escape from the questionalbe friends
Will have to be asserted through answerable ways
Till now much conversed of displaceable distress
Let us now have time of converstion changed !

❐♦❐

No One But Moon in Conversation !

Translated by : Tariq Kabuli

From a
Multitude of desolated dreams :
Miserable destiny wakes up
Full of tragedies
Time has taken him everything
Simultaneously Playing itself and
Spectator to his own actions!
What he dreamt of :
A stormy thoughtful odyssey
Baren without any favour or kindness
The first ray of moon light, to which he
Whispers with!! Still feels
Chained in continuous wishful thoughts.
Of late, the moon light ready
To give sacrifice!
For his
Pen & words.
Despite the deft heart,

misfortunes-dawn to dusk.
To lament on is a crime, to sigh for is a sin !
This shows another sign of being blood thirstly :
Despite land being our beloved country.

❐♦❐

Till now much conversed of displaceable distress
Let us now have tune of conversation changed !
Neither to mention of its cruel luscious public
Nor to be mentioned restricted times:
Nor times happened as paternal or sympathiser,
Nor the time compromises- but a fiasco:
The time resembles to that of silken coloured thread :
The time like a mere hallow hand :
Could the life he made unreasonable by such a mere action?

❐♦❐

Till now much conversed of displaceable distress
Let us now have tune of conversation changed !
Since long forgotten mine fraternity;
Have long been forgotten a sincere way;
Who bothers about thou to stroll slowly;
Long have I forgotten sweet heart at every moment;
Long have I forgotten the pathetic heart;
That sublime seasonal support of relatives-
Brilliant friends, joyous dew.

❐♦❐

Till now much conversed of displaceable distress
Let us now have tune of conversation changed !
Stranger sometimes stares at you:
I wish to scratch his eyes out.
Ventilation ceased to fan fresh air, the
environment went ugly;
Not to recollect that desirable wet season;
On being stopped how many moments
would be eternal;
Having walked, predeter minedly, don't leave
off thy lap;
But a storm blew off furiously-
Uprooted the roads, restricted the vital life off.

❐♦❐

Till now much conversed of displaceable distress
Let us now have tune of conversation changed !
To have a dreamy outline in the eyes-
Lest tempestous time would put it off;
In the shade of imagination do I live;

The Disturbed City

Translated by : Tariq Kabuli

Till now much conversed of displeasurable distress
Let us now have tune of conversation changed!
To escape from the questionable times,
Will have to be asserted though answerable ways:
Let us move to recreational site,
Where at would be graceful love;
Where to converse with the lit of imagination,
Sincerely passionate environment seems to be young

❐♦❐

Till now much conversed of displaceable distress
Let us now have tune of conversation changed!
Spring season makes every bough afresh -
Afresh the colour on whole life;
Through the garden a command sounded up,
For every dreamy imagination may be anew;
Come up! Here song, and beloved too residing-
From rose and tulip faces some thing charm reflects :
Tree as stone, bunds fragrant sensuously captivating to
Bess one every bought ready to swarm off.
The grandeur of the garden feast slowly embellished

❐♦❐

Till now much conversed of displaceable distress
Let us now have tune of conversation changed!
Never to mention of what has befallen on the land
Nor to mention of how many youths were moved down:
Nor to mention of the slain persons on the way:
Nor to be mentioned whether days are shorter
or nights longer.
With certainity our land being a sublime paradise-
Nowhere else its prototype, nor its parallels;
Blown off by oppressive violent wind:
Confidence turned confused, imagination
affected by fear-psychosis

❐♦❐

Till now much conversed of displaceable distress
Let us now have tune of conversation changed !
Since long arrant fools hovered over the heads:
Peaceful signs have got dimmed :
Arms and swords since long out of their sheaths:
No traces of light else grief stricken every home :
To be raining brimstones from committed

